حضور! یہ ہیں عدم

(عدم خاکہ نگاروں کی نظر میں)

تحقیق، تجزیہ، متن

مرتب: محمد اکرم سعید

Book Name: Huzoor! Yeh Hain Adam

Compiled by: Dr. Muhammad Akram Saeed

Phone No. 0335-4921473

Co-ordinated by: Sadia Zafar, Rifat Saeed

Arranged by: Professor Dr. Khurram Abbas Virk

Composed by: Ashraf Naqvi. Phone # 0345-6352439

Publishing Year: 2024

نام کتاب: .... حضور! یہ ہیں عدم

مرتب: .... پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سعید

معاونت: .... سعدیہ ظفر، رفعت سعید

اہتمام: .... پروفیسر ڈاکٹر خرم عباس ورک

کمپوزنگ وسرِ ورق:............ اشرف نقوی 0345-6352439

تعداد: 500

سالِ اشاعت:.................. 2024

قیمت: .... -/500 روپے

پبلشر کا نام

اپنے والد

چوہدری محمد علی مرحوم

اور

اپنی والدہ

حمیدہ بی بی (مرحومہ)

کی علم دوستی کے نام

مَیں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا
عدمؔ

عدمؔ

زیرِ نظر کتاب شاعرِ رومان سیّد عبدالحمید عدمؔ پر لکھے گئے دستیاب خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ خاکے مختلف کتب اور رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو یک جا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اہلِ قلم نے عدمؔ صاحب کی شخصیت کے حوالے سے جو لکھا وہ قارئین ایک جگہ پر ہی پڑھ لیں۔ ہر اِنسان کی اپنی نظر اور زاویۂ نظر ہوتا ہے تو خاکہ نگاروں نے جس انداز سے اُنھیں دیکھا اور شخصیت کے جس پہلو کو دیکھا وہ بیان کیا ہے اس طرح ہر خاکہ نگار کا نقطۂ نظر بھی اور عدمؔ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

کتاب کو تین حِصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے حصّے میں راقم کا ایک مضمون ہے جو عدمؔ پر لکھے گئے خاکوں اور خلشؔ ہمدانی صاحب کی کتاب ''عبدالحمید عدمؔ، نجی و مجلسی زندگی'' کی مدد سے لکھا گیا ہے۔

اِس مضمون میں بہت سے اقتباسات دیے گئے ہیں کیوں کہ مقصد خاکہ نگاروں کی نگارشات کی مدد سے عدمؔ صاحب کی شخصیت کو سامنے لانا تھا۔ راقم کی کوشش اپنی جگہ مگر قارئین خود خاکے پڑھ کر اُن کی شخصیت کو جان سکتے ہیں۔

دوسرے حصّے میں دستیاب خاکوں کا مکمل متن ہے۔ یہ خاکے مختلف کتب اور رسائل سے لیے گئے ہیں۔ اِنھیں بڑی کوشش اور محنت سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

تیسرے حصّے میں وہ تحریریں ہیں جنھیں خاکہ نہیں کہا جا سکتا مگر عدمؔ صاحب کے

بارے میں کچھ معلومات ضرور ہیں۔ اِن تحریروں کو ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

مَیں اُن تمام اہلِ قلم کا شکر گزار ہوں اور اپنے اُن تمام احباب کا بھی جنھوں نے اِن خاکوں کے حصول میں میری مدد کی۔

سلامت رہیں، خوش رہیں۔

محمد اکرم سعید
چک نمبر 173، رسول پور جٹاں
شیخوپورہ
0335-4921473

فہرست عنوانات

ضمیمہ جات

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم سعید

حضور! یہ تھے عدم

(شخصی خاکوں کے پس منظر میں شخصی تجزیاتی مطالعہ)

شاعرِ رومان سید عبدالحمید عدؔم 10۔اپریل،1910ء کو لائل پور میں پیدا ہوئے۔ بقول عدؔم صاحب:

''آبائی وطن تلونڈی موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ ہے لیکن 1910ء میں والد صاحب کاروبار ے سلسلے میں عارضی طور پر لائل پور میں اقامت پذیر تھے اس لیے راقم الحروف کی تشریف آوری وہیں ہوئی۔''1

بعد میں اُن کے والد مستقل لاہور منتقل ہو گئے اور بقول عدؔم صاحب:

''میں نے اپنی تعلیم لاہور ہی میں مکمل کی۔ میٹرک اِسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے کیا۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا کہ والدِ گرامی کا انتقال ہو گیا اور میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت کر لی۔''2

حمیر ہاشمی بیان کرتے ہیں کہ:

''1926ء میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی ذمے داری عدؔم کے کاندھوں پر آن پڑی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ایف۔اے کے بعد 1929ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔''3

اِس سلسلے میں اکمل علیمی صاحب لکھتے ہیں:

عدؔم سونے کا چمچہ مُنہ میں لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ 1926ء میں والد کا انتقال ہوا تو تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھر کی مالی ذمہ داریاں ان کے کمزور کندھوں پر آ گئیں۔ ایک رشتے دار نے کچھ اور تعلیم اور سرکارِ ہند کی ملازمت حاصل کرنے میں امداد کی۔ اُن کو اُمید تھی کہ وہ برسرِ روزگار ہو کر اُن کی بیٹی سے شادی کر لیں گے، جو اُنھوں نے کی۔''4

اکمل علیمی صاحب نے اُس رشتے دار کا نام ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی کسی اور تذکرہ نگار یا خاکہ نگار نے اِس بارے کوئی اشارۃً ہی بات لکھی ہے۔ ممکن ہے اپنی بیٹی کے رشتے کی خاطر اُن کے ہونے والے سُسر نے کوئی مدد کی ہو۔ اُن کی ملازمت کے بارے میں شاد امرتسری کا کہنا ہے کہ:

بی اے کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔اے۔ایس (سبارڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس) کے امتحان میں دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر دفتری کام میں محو ہو گئے۔" 5

شاد امرتسری صاحب نے تعلیم بی۔اے بتائی ہے اور کہا ہے کہ بی۔اے کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک بھرتی ہوئے۔ جب کہ عدم صاحب کا اپنا کہنا یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ملازمت اختیار کر لی تھی۔ عدم صاحب کا کہنا ہے کہ:

تعلیم سے فراغت (انٹرمیڈیٹ) کے بعد ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر اِسی محکمہ سے منسلک ہو گیا۔ 1941ء میں محکمے کا بلند ترین امتحان SAS (ایس۔اے۔ایس) اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1948ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے عقد ہو گیا اور اپریل 1966ء میں اسی عہدے سے پنشن پر رُخصتی ہوئی۔" 6

حزیں کاشمیری صاحب نے عدمؔ صاحب کی جائے پیدائش تلونڈی موسیٰ خاں، سن پیدائش 1909ء، ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت آڈیٹر ملازمت کا آغاز 1928ء اور سنِ وفات 1967ء بتایا ہے۔ 7

حزیں کاشمیری صاحب نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں، اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہ تمام معلومات درست نہیں ہیں۔ اُن کی جائے پیدائش لائل پور، سنِ پیدائش 1910ء، ملازمت کا آغاز 1929ء اور سنِ انتقال 1981ء ہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحوں میں حوالہ جات کے ذریعے اندراج کیا گیا ہے۔ حزیں کاشمیری صاحب نے اُن کی شادی کا سال 1927ء صحیح لکھا ہے۔

عدمؔ صاحب نے ملازمت کا آغاز 1929ء میں کیا۔ اپنے لااُبالی پن اور خود فراموشی کے

باوجود، اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو بڑے احسن انداز میں نبھایا۔

اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

''وہ ملٹری اکاؤنٹس میں بڑے ذمہ دار افسر تھے اور ساری عمر اُنھوں نے ڈیوٹی انتہائی ذمے داری اور دیانت داری سے نبھائی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ساری رات محفلِ ناؤنوش گرم رہی۔ ہم رات کو دو بجے عدؔم صاحب کو اُن کے چھاؤنی والے گھر چھوڑ کر آئے، تصور میں یہ بات نہیں آتی تھی، یہ شخص دوسرے روز تین بجے سے پہلے سو کر اُٹھے گا لیکن یقین کریں، اِس بات کے عینی گواہ موجود ہیں کہ دوسرے روز عدم صاحب ٹھیک آٹھ بجے اپنے آفس میں بیٹھے صوفی حالت میں بڑی ذمہ داری سے کام کر رہے ہوتے۔''8

سید ضمیر جعفری صاحب اُن کی ملازمت کی ذمے داریوں کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''عدم صاحب گوست الوجود تھے مگر بعض باتوں میں اُن کی مستعدی پر حیرت ہوتی ہے۔ اُن میں ایک دفتر کی حاضری تھی۔ دفتر کے وقت گھر سے یوں نکل جاتے جیسے تیر کمان سے۔''9

عدم صاحب نے اپنی ذات سے یکسر مُنہ موڑ کر اگر کسی چیز سے مفاہمت کی تھی تو وہ ملازمت تھی۔ سید ضمیر جعفری صاحب مزید لکھتے ہیں:

''عدم صاحب جب تک کلرک رہے، اُن کے سپرنٹنڈنٹ، یونٹ اکاؤنٹنٹ اور افسرانِ بالا اُن سے عموماً خوش رہتے تھے کہ وہ بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ مگر بعض افسر خفا بھی رہتے تھے کہ عدم اِتنی اچھی انگریزی کیوں لکھتے ہیں۔''10

سید ضمیر جعفری صاحب نے عدم صاحب کو بطور کلرک بھی اور بطور افسر بھی نوکری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

''میں نے اُن کو افسری کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ڈسپلن کے بغیر کام کے معیار کو برقرار رکھنے کا سلیقہ اُن پر ختم تھا۔ دفتر کے کلرک تلازمہ غزل کی طرح ہنسی خوشی، صبح سے شام تک کام میں جُتے رہتے تھے۔''11

افسر کبھی اُن سے آزُردہ ہوں تو ہوں مگر ماتحت ہمیشہ اُن سے خوش رہے۔ ملازمت میں حافظ لدھیانوی

صاحب نے اُن کے ساتھ کام کیا ہے وہ اِس بارے میں لکھتے ہیں:

''عدم زندگی میں جتنا خود فراموش تھا، دفتری زندگی میں اُتنا ہی باہوش اور حاضر دماغ تھا۔۔۔۔میں نے عدم جیسا طباع، ذہین، ذی علم افسر نہیں دیکھا۔ عدم اِتنی خوب صورت انگریزی لکھتا تھا کہ پڑھنے والے اُس کی علمی استعداد، اُس کی قابلیت، اپنے کام میں مہارت اور اندازِ تحریر کے معترف ہو جاتے تھے۔ اُس کی تحریروں میں روانی، موضوع پر اختصار اور جامعیت، اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔ دفتر میں وہ اِس انہاک سے کام کرتا تھا جیسے شعر تخلیق کر رہا ہو۔ اُس کی تحریر واقعی تخلیق کا شہ پارہ تھی۔''12

دفتری امور کے بارے وہ جتنے ذمہ دار ہوں مگر گھر اور گھریلو معاملات بارے اُن کا رویہ ہمیشہ غیر ذمہ دارانہ رہا۔ سید ضمیر جعفری صاحب لکھتے ہیں:

''گھر کا کارخانہ چلانے کے واسطے نون، تیل، لکڑی کے کھڑاگ سے اُن کو وحشت تھی۔۔۔۔۔۔امورِ خانہ داری سے اُن کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ عدؔم صاحب کسی دوسرے گھر میں رہ رہے ہیں۔''13

گھریلو زندگی بارے اُن کا رویّہ ایسا ہی رہا۔ یہ ذمہ داری نبھانے اور یہ بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانے کا اُنھوں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اُن کے گھریلو حالات بارے صادق نسیم صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''عدؔم صاحب، جب پنڈی رہتے تھے تو ہمارے گھر سے دو فرلانگ پر دسہرہ گراؤنڈ میں مکان تھا۔ اِس قربت کی وجہ سے مجھے اُن کے گھر کے حالات اور گزر اوقات کا پتہ چلا۔ تنخواہ کا بمشکل دسواں حصّہ گھر دیتے۔ اکثر فاقوں کا عالم رہتا۔ ایک دن گھر میں فاقے کا عالم تھا۔ پڑوسیوں نے ترس کھا کر ایک سیر آٹا بھیج دیا۔۔۔۔۔۔ محکمے والوں کو پتہ چلا تو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو آدھی تنخواہ بیگم عدم کو گھر بھجوا دیتے۔''14

گھر میں فاقوں کا راج رہا اور عدم صاحب اپنی فاقہ مستی میں اپنی ڈگر پر چلتے رہے۔ کشور ناہید تحریر کرتی ہیں:

''پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی تو اِرد گرد مخمور دوستوں کا گروہ سامنے ہوتا تھا۔ وہ تنخواہ اُن میں تقسیم کر کے، دفتر سے قرض لے کر گھر جایا کرتے تھے۔''15

یہ تنخواہ کیسے تقسیم ہوتی تھی، اِس کا ذکر حافظ لدھیانوی صاحب ایسے کرتے ہیں:

''عدم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شاہ خرچ ہوتا تھا۔ دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا۔ اُسے آنے والے کل کی پروانہ تھی۔ پہلی تاریخ سے شراب کے دَور چلنا شروع ہو جاتے۔ راتیں شراب خانے کی نذر ہو جاتیں۔ احباب کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ چار پانچ دن اِن ہی ہنگاموں میں گزر جاتے۔ پانچ چھ روز بعد اُس کی جیب خالی ہوتی۔'' 16

عدم صاحب تو ادھر دوستوں کے ساتھ نا ؤنوش میں مصروف کُھلے دل سے پیسے خرچ کر رہے ہیں اور گھر کیسے چل رہا ہے؟ اِس بارے تمام خاکہ نگاروں نے اُن کی اہلیہ محترمہ کی تعریف کی ہے۔ خلش ہمدانی صاحب لکھتے ہیں:

''عدم صاحب کی بیگم صاحبہ یقیناً ایک عظیم خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اپنی پوری زندگی کرب و اذیت کے لمحوں میں رہ کر اُن کے ساتھ بسر کی۔ عدم صاحب نے کبھی بھی عیال داری کے فریضے کی طرف توجہ نہ دی۔ تنخواہ ملتی تھی تو ان پیسوں کی شراب پی لیتے تھے۔ میں حیران ہوں کہ وہ عظیم خاتون گھر گرہستی کا بوجھ اُٹھا کر طویل عرصے تک کیوں کر زندہ رہیں۔'' 17

وہ نہ صفر زندہ رہیں بلکہ گھر کو بھی بہت خوش اسلوبی سے سنبھالا اور بچوں کی بھی عمدہ تربیت کی اور اُنھیں اعلیٰ تعلیم بھی دِلوائی۔ حافظ لدھیانوی رقم طراز ہیں:

''عدمؔ صاحب کی رفیقۂ حیات سلیقہ مند، سمجھ دار اور ذمہ دار خاتون تھیں۔ عدم کے لااُبالی پن اور غیر ذمہ دارانہ زندگی کے باوصف اُس نے بچوں کی عمدہ تربیت کی اور اُنھیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔'' 18

اے حمید صاحب، اسے عدمؔ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم سمجھتے ہیں کہ:

''اللہ نے اُنھیں نہایت وفا شعار، دُور اندیش اور صابر بیوی اور ہونہار اولاد عطا کر دی تھی۔ بیگم صاحبہ نے جس بُردباری، تحمّل اور صبر وشکر اور دانش مندی کے ساتھ عدم صاحب کا ساتھ نبھایا اور اولاد کی پرورش کی یہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُنھیں لائق بنایا اور وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور چھاؤنی میں اپنی عالی شان کوٹھی بنوائی۔'' 19

اسرار زیدی صاحب، بیگم عدم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اِس امر کا پوری طرح علم ہے کہ یہ عدمؔ کی بیوی ہی تھیں جو کم و بیش نصف صدی تک عدمؔ جیسے آدمی سے نباہ کر سکیں۔ گھر کی ذمہ داری، اولاد کی پرورش، حتیٰ کہ خود عدم کی دیکھ بھال جس طرح اُنھوں نے کی، وہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ عدم صاحب قریب قریب ہر روز مدہوشی کے عالم میں نصف شب کے بعد گھر پہنچتے بلکہ پہنچائے جاتے اور یہ اُن کی مرحومہ بیگم تھیں جو اس کیفیت میں نہ صرف یہ کہ اُن کی مناسب دیکھ بھال کرتیں بلکہ اس کے بعد عدمؔ کی غذا اور لباس کا بھی پوری طرح خیال رکھتی تھیں۔''20

اِتنی وفا شعار، سلیقہ مند، گھر اور بچوں کو سنبھالنے، عدم صاحب کا خیال رکھنے والی اور خدمت گزار بیوی کے ہوتے ہوئے بھی عدم صاحب نے ایک اور شادی کر لی۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے بچپن میں، پونا میں، عدم صاحب کی اُس نئی بیوی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُسے بازار سے سودا سلف بھی لا کر دیتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس بیوی کی بدمزاجی کے قصّے بھی بیان کیے ہیں۔ عدم صاحب نے خود بھی خلش ہمدانی صاحب کے استفسار پر اس شادی کی کہانی اور بیوی کے مزاج کے بارے تفصیل سے بتایا ہے۔ عدمؔ صاحب بیان کرتے ہیں:

''ملکی میری عراقی بیوی تھی۔ اُس کا پورا نام ملکیہ تھا۔ میں دوسری جنگِ عظیم میں عراق گیا تھا۔ شام کو روزانہ ایک کیفے میں جایا کرتا تھا۔ وہاں ملکی کو اکثر دیکھتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسے اپنی جانب ملتفت پایا اور پھر یہ ملاقاتیں شادی پر منتج ہوئیں۔ یہ شادی ملکی کی پسند پر ہوئی۔۔۔۔۔ ملکی کوئی اِتنی خوب صورت نہ تھی، بس واجبی سی شکل و صورت کی عورت تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر گالی گلوچ پر اُتر آتی۔ جب میں عراق سے اُس کے ساتھ واپس انڈیا آیا اور میرا پوسٹنگ پونا ہوا تو محکمہ کے آدمیوں کی بیویوں نے اُسے میری پہلی شادی اور بچوں کا بتایا تو اُس کا ردِ عمل بڑا سخت ہوا۔ مسلسل کئی دِنوں تک مجھ سے لڑتی رہی۔ نہ مجھے کھانا دیتی تھی اور نہ ہی ازدواجی حقوق کی ادائیگی کرتی تھی۔ ایک دن غصّے میں آ کر مجھ سے کہنے لگی:

''سالا تمھارے پیچھے ہم نے اپنا بے بی کو بھی چھوڑا۔ تم سالا بڑا احرامی

آدمی ہے۔ہم کو ایک دم چکر دیا ہے۔ہم تمھارے ساتھ اب کیسے رہ سکتا ہے۔سالا، تم ایک دم سکانڈرل (SCOUNDREL) ہے۔'' میں نے اُس کی منت سماجت کی اور اُسے راضی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا۔وہ ہنس پڑی ہنس پڑی اور اُٹھ کر میری جھولی میں بیٹھ گئی۔پہلے کہتی تھی''سالا، تم ایک دم اوّل نمبر کا جھوٹا ہے''اب کہنے لگی:

سالا، تم اچھا آدمی ہے۔ایک دم ڈرنک بند کرو۔''21

عدم صاحب نے ملکی کی بد مزاجی کے حوالے سے ایک اہم واقعہ یوں بیان کیا ہے:

''ایک دفعہ میں پی کر رات دیر سے لوٹا۔پہلے تو دروازہ نہ کھولتی تھی۔بالکنی میں کھڑی مجھے بڑی بڑی گالیاں دیتی رہی۔آخر کار گلی کی عورتوں نے آکر سمجھایا بجھایا۔اُس نے دروازہ کھولا۔جونہی میں لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر سیڑھیوں کے دروازے میں پہنچا، مجھے اِتنے زور کا دھکا دیا کہ میں سیڑھیوں میں گرا اور پھر لوٹ پوٹ ہوتا ہوا نیچے سڑک پر آرہا۔اِتنا زور سے گرا کہ بے ہوش ہو گیا۔دفتر کے ساتھی اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ڈاکٹر کی مسلسل کوششوں سے کوئی دو گھنٹے بعد ہوش آیا۔وہ مجھے ہسپتال دیکھنے بھی نہیں آئی۔

بڑی بدمزاج اور اکھڑ عورت تھی۔''22

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب، عدمؔ کی دوسری شادی اور ملکیہ کے بارے یوں قصّہ بیان کرتے ہیں:

''عدمؔ صاحب جن دِنوں عراق میں تھے تو اُن کا ایک عراقی کنبہ میں آنا جانا ہو گیا، جہاں عدم صاحب ایک خاتون کے ساتھ اٹک گئے۔یہ ملکیہ تھی، جسے واپسی پر اپنے ساتھ ہی لیتے آئے۔یہ بیوہ تھی اور بغداد میں ایک بچہ چھوڑ کر اُن کے ساتھ آئی تھی۔اس کا رنگ سانولا تھا اور شاید چیچک کے داغ بھی تھے۔فراک پہنتی تھی اور اُس زمانہ کا مشہور سگریٹ 'پاسنگ شو' پیتی تھی۔ملکیہ کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے زیادہ تر آزاد تھی اور میں (ڈاکٹر

صاحب اپنے بچپن میں) دوپہر کا کھانا ایک ایرانی ریسٹورنٹ سے لا کر دیا کرتا تھا۔" 23

ڈاکٹر صاحب مزید بیان کرتے ہیں:

"عدم صاحب پی پلا کر رات کو دیر سے گھر آتے تو ملکیہ کی غصیلی آواز میموں جیسی غلط اُردو آدھی رات کو ساری چال میں گونجتی .... مگر عدم نے دیر سے گھر آ کر کبھی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اوّل تو جلی بُھنی ملکیہ دروازہ ہی نہ کھولتی تھی جب کہ شرابی کے ذہن والی یکسوئی کے ساتھ یہ صابرو شاکر زنجیر ہلاتے رہتے تھے۔ اس کے بعد جب دروازہ کُھل جاتا تو طوفان بن کر اُن کا استقبال کرتی۔ یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔ بعض اوقات وہ غصّہ میں آ کر کوئی چیز دے مارتی۔ ایک مرتبہ دھکا دیا تو سیڑھیوں سے لُوھکتے ہوئے دھم سے نیچے آ پڑے۔

ایک رات اُس نے اُن پر سلائی مشین اُٹھا پھینکی تھی۔ چنانچہ مشین اور عدم نے اکٹھے سیڑھیاں طے کیں جس کے نتیجے میں دونوں میں "چِب" پڑ گئے۔ اِس نوع کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔" 24

گو ڈاکٹر صاحب کا وہ بچپن کا زمانہ تھا مگر وہ ان حالات اور واقعات کے عینی گواہ ہیں۔ اُنھوں نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

عدم صاحب ملکیہ کی واپس عراق روانگی اور پہلی بیوی کے اِس شادی پر ردِّ عمل اور رویّے بارے خود بیان کرتے ہیں:

"پونا سے میرا پوسٹنگ انبالہ چھاؤنی میں ہو گیا۔ میں ملکی کو لے کر انبالہ آ گیا۔ اور پھر اچانک ایک دن گھر والے بھی انبالہ پہنچ گئے۔ میں نے ملکی کے لیے ایک دوسرے گھر کا انتظام کر دیا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا مگر ملکی کو باقاعدگی سے خرچہ دیتا رہا۔ دن میں کچھ وقت اُس کے ساتھ گزارتا، راتیں پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزارتا چونکہ واپسی پر مجھے کسی ہنگامہ آرائی کا کوئی خدشہ نہ تھا جب کہ ایسی حالت میں اگر ملکی کے ہاں جاتا تو وہ ایک طوفان برپا کر دیتی۔"

اپنی پہلی بیوی کی وفا شعاری اور شرافت کی تعریف کرتے ہوئے عدم صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''جب وہ بچوں کو لے کر پنڈی سے انبالے پہنچی اور اُس نے گھر میں ایک جواں سال غیر ملکی خاتون دیکھی، یقیناً دل میں بے حد رنجیدہ خاطر ہوئی ہوگی مگر مُنہ سے اُس خدا کی بندی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُس کی خاموشی اور موقعہ کی نزاکت کے مطابق صبر و شکر خاموش اظہار تھا۔ اور میں شرم کے مارے بیوی بچوں سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ شاید میری بیوی نے بچوں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی بچہ بھی میرے سامنے اِس موضوع پر بات نہ کرے۔ میں ایک بھاری بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری پہلی بیوی میری باز پُرس کرے، میرے ساتھ لڑے جھگڑے اور میں بھی اِس طرح اپنے دل کا غبار نکالوں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی نہ بولا اور میری ضمیر مجھے برابر کچو کے لگاتی رہی۔ میرے بیوی بچوں کے آنے سے ملکی کا زور ٹوٹ گیا۔ اب میں جاتا تو وہ مجھ سے بڑی ہی مختصر بات کرتی۔ جس طرح میری بیوی کے صبر نے مجھ پر ایک اثر مرتب کیا تھا، میں سمجھتا ہوں یہی کیفیت ملکی کی بھی تھی۔ وہ بھی اِس بوجھ کو اُتار پھینکنا چاہتی تھی لیکن میری بیوی نے ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد میں دو دن ملکی کے پاس نہ جا سکا۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر سیدھا اُس کے کوارٹر کی طرف گیا۔ خلافِ معمول اُس گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ساتھ والوں سے پوچھا۔ ایک نے مجھے بتایا'' آج دو دِن ہوئے ملکی واپس عراق چلی گئی ہے۔ چابی میری بیوی کو دے گئی ہے کہ آدم صاحب (عدم صاحب) آئیں تو اُنھیں دے دینا اور اُن کو بتا دینا کہ آپ کا سامان جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ خدا آپ کو خیریت سے رکھے۔ خدا حافظ۔'' 25

یوں ملکی عدم صاحب کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل کر عراق واپس چلی گئی۔ اِس طویل کہانی میں پہلی بیوی کی وفا، شرافت اور صبر و شکر کی بھی مکمل تفصیل موجود ہے۔ ملکی تو واپس چلی گئی مگر جہلم کی بدنامِ زمانہ

اور بازاری خاتون شاہدہ ابھی موجود ہے۔شاہدہ بارے عدم صاحب کا بیان ہے کہ:

''شاہدہ مجھے اِس لیے اچھی لگتی ہے کہ یہ ملکی کی ٹرو کاپی (TRUE COPY) ہے۔شاہدہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے ملکی یاد آ جاتی ہے۔اُسی شکل وصورت اور اُسی ٹمپرامنٹ (TAMPERAMENT) کی وہ بھی تھی۔ اِسی لیے تو یہ مجھے پیاری لگتی ہے ۔۔۔ حالانکہ عورتوں سے ملنے جُلنے میں سیکس کا کوئی عمل دخل نہیں۔۔۔۔۔۔اب اِس طرف رغبت ہی نہیں ہوتی۔'' 26

شاہدہ بھی اپنے ہی جیسی اپنی دوساتھی عورتوں کے ہمراہ خلش ہمدانی صاحب کو بتاتی ہے کہ:

''شاہ صاحب (عدم صاحب) بڑے بھلے مانس ہیں۔وہ عورتوں کی بے حُرمتی نہیں کرتے۔وہ عورت سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ زلفیں بکھرا کر اُنھیں شراب پلائے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں.................. وہ عورتوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے۔شراب کو عورت پر ترجیح دیتے ہیں۔'' 27

شادامرتسری کہتے ہیں، عدم صاحب نے کبھی عشق نہیں کیا اور عشق نہ کرنے کا سبب اُن کی فطری بے راہ روی اور اُن کا طبعی لااُبالی پن ہے۔اُن کا کہنا ہے:

''عدم صاحب نے کبھی کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق و پجاری ہیں اور یہ احساس اکثر ہنگامی ہوتا ہے۔'' 28

اِس ہنگامی احساس کی عمدہ مثال جہلم کی شاہدہ سے تعلق اور لاتعلقی ہے۔

اے حمید صاحب نے طوائفوں سے تعلق کے پس منظر میں، عدم صاحب کے ایسے ہی مزاج کو دیکھا اور بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

عدم صاحب شاہی محلے بھی اکثر جاتے تھے مگر ''وہ کوئی تماش بین یا طوائفوں سے عشق کرنے والے رند شاہد باز نہیں تھے۔ یہ بات اُن کے مزاج کے بالکل خلاف تھی ۔وہ شاہی محلّے طوائفوں کی زبان سے اپنی غزل سُننے جاتے تھے۔اُنھیں صرف اتنا ہی شوق تھا کہ طوائف اُن کے سامنے بیٹھی اُن کی کوئی غزل گا رہی ہو،شاہی محلّے کے کوٹھوں پر بھی عدم صاحب کا کلام بے حد مقبول تھا اور گانے والیاں عدم صاحب کی گرویدہ تھیں اور اُن کا بے حد احترام کرتی تھیں۔'' 29

اِن تمام بداعمالیوں اور گھر داری سے بے رغبتی کے باوجود اُنھیں اپنے اہل وعیال سے محبت تھی اور اس محبت کی شدت و رِقّت کا اندازہ بقول سید ضمیر جعفری اِس بات سے ہوسکتا ہے کہ:

''حجام سے اپنے سامنے گھوڑے (بڑا بیٹا) کی نعل بندی یعنی اُس کے ناخن نہیں ترشوا سکتے تھے۔۔۔۔ وہ اپنے گھر کو مسرُور، پُر اطمینان اور فراغت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے مگر بس ایسے ہی جیسے اُن کے شعر آپ ہی آپ پھلتے رہتے ہیں۔'' 30

اور پھر رفیقۂ حیات کی موت پر عدم صاحب کی حالت، دُکھ اور غم کا پتہ چلتا ہے۔ بیوی کی موت نے تو عدؔم سے وہ سب کچھ چھین لیا جو اُن کا طُرّہ ٔ امتیاز تھا۔ تن بدن کا ہوش تو اُنھیں پہلے بھی نہ تھا مگر بیوی کے جانے کے بعد تو یہ کیفیت مستقل طور پر مسلط ہوگئی۔

اسرار زیدی صاحب کو، ایک انٹرویو کے دوران اپنی حالت اور کیفیت کو عدؔم صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''میری بیوی میرے لیے بہت کچھ تھیں۔ وہ ایک مکمل رفیقۂ حیات تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی صحیح بنیاد پر پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے بغیر میں اپنی تخلیقی زندگی کا تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا۔ اگر وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتیں تو میرے لیے سکون کا ایک لمحہ بھی ممکن نہ تھا۔۔۔۔ بیوی کے انتقال نے میری تمام صلاحیتیں سلب کر لی ہیں اور اعصاب کو اِس شدّت کے ساتھ متاثر کیا ہے کہ میں اِس موضوع پر کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔'' 31

زندگی کے تقاضے خواہ کچھ بھی تھے، عدم صاحب نے اپنی زندگی، اپنے ڈھب، اپنے رنگ، اپنے تقاضوں اور اپنی ضرورتوں کے مطابق بسر کی۔ شاعری، شراب، دوست اور دفتر، یہی اُن کی زندگی اور کُل کائنات تھی۔ فارغ بخاری اُن کی شخصیت بارے لکھتے ہیں:

''عدم اپنی عام زندگی میں بڑا بونگا شخص تھا۔ شاعر سے زیادہ اُس پر کسی کارخانے کے مزدور کا گماں ہوتا۔ نہ اچھا پہننے کی فکر، نہ اچھا کھانے کا شوق، نہ صحت و صفائی کا خیال، کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتا، غسل کرنا تو کجا، ہاتھ مُنہ دھونے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دانت تو اُس نے زندگی بھر کبھی صاف نہیں کیے۔ بالوں کو کنگھی کرنا بھی وقت کا ضیاع سمجھتا۔'' 32

شاد امرتسری سے عدم کی پہلی ملاقات 1945ء میں ہوئی۔ اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے عدم کے حُلیے، لباس اور جسمانی حالت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، توند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے خواُس کے جسم پر اٹک گئے ہوں، بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب، پاجامہ نما ڈھلکی ہوئی پتلون، گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا۔'' 33

وہ مزید لکھتے ہیں:

''وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لطف یہ کہ اُنھیں اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے۔ کوٹ اور پتلون کی تہہ اکثر خراب ہوتی۔ کپڑے اُن کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک مُنہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اُٹھے، کُلّی کی اور دفتر چلے گئے۔'' 34

عدم اِن تمام چیزوں سے بے نیاز تھا۔ اُس کے لیے زندگی سرمستی و سرخوشی کی ایک لہر تھی۔ بقول حافظ لدھیانوی:

''عدم نے زندگی کے تمام تفکرات کو، تمام پریشانیوں کو، تمام اُلجھنوں کو غرقِ مے ناب کر رکھا تھا۔'' 35

قمر یورش نے عدؔم کی حسین و جمیل غزلیں پڑھ کر اپنے ذہن میں اُن کا ایک ایسا خاکہ ترتیب دے رکھا تھا جس کے مطابق وہ دھان پان، پستہ قد، گورے چِٹّے نوجوان، لکھنوی انداز کے شاعر تھے مگر جب پہلی ملاقات ہوئی تو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بقول اُن کے:

''عدم مجھے شاعرِ رومان کی بجائے، اچھے خاصے باڈی بلڈر، گُنّے باز یا ناسخ کی طرح پہلوان نظر آرہے تھے۔ سانولا رنگ، دیوقامت، مَیں اُنھیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ وہ مجھے ہرگز شاعر نظر نہ آتے تھے۔ وہ مجھے رُستمِ زماں گاماں پہلوان کے شاگرد نظر آتے تھے مگر اُن کا گول چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا۔ ہونٹوں پر بڑی دل کش مسکراہٹ۔'' 36

تنومند اور فربہ جسم کے سبب قمر یورش صاحب کو عدمؔ رُستمِ زماں کے شاگرد اور ناسخ جیسے پہلوان نظر آئے مگر اِس فربہ جسم میں بقول سید ضمیر جعفری:

''عدم دوہرے جثّے کے تنومند شخص ہیں لیکن اِس تن و توش میں فروتنی ہی فروتنی بھری ہوئی ہے۔''37

بعد کی ملاقاتوں کے بعد قمر یورش صاحب بھی برملا تسلیم کرتے ہیں:

''خوب صورت شاعر، بے حد دوست نواز، وہ دوستوں پر دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے والے، جتنے بڑے شاعر، اُتنے ہی بڑے انسان۔ عدمؔ صاحب تو عجز و انکسار کا مجسّمہ تھے۔ بات بات پر ہاتھ جوڑتے، اُنھیں اپنی بڑائی کا کوئی غرور نہ تھا۔38

عجز و انکساری کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو سادگی اور معصومیت ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں اُن کی شخصیت کی یہ خوبی نظر آتی ہے۔ شاد امرتسری تو عدمؔ صاحب کے مزاج کو بالکل بچوں جیسا مزاج سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''عدم صاحب بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے ناآشنا ہیں۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں، دے نہیں سکتے۔''39

اِس عجز، انکساری، سادگی اور معصومیت کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی کی رَوِشِ خاص دوستی اور دوست داری کے جذبوں سے ظہور پذیر ہوئی۔ ضمیر جعفری صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

''سماجی زندگی کے ہر دائرے میں اس کا سارا ریشم کی طرح نرم و ملائم شخص خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ عدم صاحب گلی محلّے میں کھیلتے ننھے مُنّے بچوں کو بھی حضور اور جناب کہہ کر بلاتے تھے۔ محبت و مروّت، امن و آشتی اور خلق و انکسار کا دوسرا نام عدمؔ ہے۔''40

فارغ بخاری صاحب کا عدم صاحب سے خلوت و جلوت میں ساتھ رہا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی اُنھوں نے، اُنھیں ناؤ نوش کی صحبتوں میں بھی، ہوش کی حالت میں بھی اور مدہوشی کے عالم میں بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ہر عالم میں اُسے ایک نہایت معصوم انسان پایا۔ وہ بلانوش ضرور تھا، مٹکے سے بھی سیر ہونے والا نہیں تھا۔ اِس کے باوجود اُسے دوسرے شرابیوں کی طرح قے کرتے بہک کر اول فول بکتے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ غیر معمولی ظرف کا انسان تھا۔ جتنی پیتا جاتا اُتنی ہوش مندی کی باتیں کرنے لگتا۔ اُسے تو آتشِ سیال نے جلا کر کُندن بنا دیا تھا۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ ایسے عالم میں اُسے کیڑے مکوڑے بھی سانس لینے والی اہم مخلوق نظر آتی اور وہ اُن سے مخاطب ہو کر کہتا: ''حضور! میں تو آپ کا خادم ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو معاف کر دیجیئے۔ حضور! میں آپ کو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔ 41

عدم نے اپنے آپ کو آتشِ سیال میں ڈال کر کس طرح کُندن بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ اِس میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں، شاد امرتسری بتاتے ہیں:

''شراب کی ایک بُری عادت نے اُن کی تمام انسانی بُرائیوں کو ختم کر دیا۔ اس مستی اور رِندی نے اُن کو معصوم بنا دیا۔ خلوص کا پیکر۔ دوستوں سے ملتے، دل آزاری کا ڈھنگ ہی اُنھیں نہیں آتا۔ کسی کو دُکھ دینا اُن کی سرشت ہی میں نہیں۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ کسی سے بغض یا عناد رکھنا اُن کی فطرت میں داخل ہی نہیں۔ دل میں کبھی مَیل نہ رکھتے اور نہ مَیل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں تھے۔ شراب نے اُن کو واقعی انسان بنا دیا۔'' 42

شاد امرتسری کا کہنا ہے کہ شراب نے اُن کی تمام انسانی برائیوں کو ختم کر کے اُنھیں واقعی انسان بنا دیا۔ اِس بات کی مزید وضاحت اے حمید صاحب اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر یوں کرتے ہیں:

''شراب بُرے آدمی کو مزید بُرا اور شریف آدمی یعنی رحم دل آدمی کو زیادہ رحم دل بنا دیتی ہے۔ عدم صاحب کے پاس شراب بھی بڑی شریف زادی بن کر آتی اور عدم صاحب زیادہ معصوم اور بھولے بھالے ہو جاتے۔ طبعاً عدم صاحب بڑے بھولے اور معصوم تھے۔'' 43

عدم صاحب کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ لدھیانوی صاحب بتاتے ہیں کہ دفتر کے بعد وہ کبھی گھر کا رُخ نہ کرتے بلکہ کسی دوست، کسی ہم مشرب کے گھر پہنچ کر محفلِ شب کا اہتمام کرتے۔ ان محفلوں کی تفصیل اے حمید صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

''عدم صاحب بے حد شاہ خرچ تھے۔ اُن کا ہاتھ اور دل بڑا کُھلا تھا۔ مَیں اِس کا شاہد ہوں کہ وہ جب محفل سجاتے تو جیب سے سارے پیسے نکال کر میز پر اپنے سامنے رکھ دیتے اور پھر وہیں سے اُٹھا اُٹھا کر خرچ کرتے رہتے۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی جیب سے پیتے تھے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔'' 44

ایک ایسی ہی محفلِ شب کا ذکر کرتے ہوئے حافظ لدھیانوی صاحب لکھتے ہیں:

''عدؔم نے ایک شب اُس دَور کے ممتاز شعراء کو شراب پلائی۔ یہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ رات بھر جشن رہا۔ شاعری کے دَور چلے۔ جب سب شراب کے نشے میں مدہوش ہو گئے تو اس کے شاعر دوست اس کی جیب سے ساری رقم نکال کر فرار ہو گئے۔ جب عدم کو ہوش آیا تو اُس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ دوسرے روز عدؔم نے دفتر آ کر یہ ماجرۂ شب بیان کیا۔ بڑی سادگی سے ہنستے ہوئے کہا: ''حافظ! دیکھو کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ میں نے دوستوں کی خاطر مدارات کی مگر وہ میری جیب پر ہاتھ صاف کر کے چلے گئے۔'' 45

لوگ عدؔم صاحب کو دھوکہ دے جاتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ لغزشوں، خامیوں، کوتاہیوں کے باوجود احباب سے انتہائی خلوص کا برتاؤ کرتے۔ دوست اُن کا قیمتی اثاثہ تھے۔ وہ دوستوں سے فریب کاری کو گناہ سمجھتے تھے۔ زندگی بھر کسی بھی موقع پر اُنھوں نے دوستوں سے بے وفائی یا بے مروّتی کا اظہار نہیں کیا۔ بقول حافظ لدھیانوی صاحب:

''دوستوں کے سلسلے میں اُس کا قلب صاف شفاف آئینے کی طرح تھا۔ اگر عدؔم کو گمان بھی گزرتا کہ اُس کا فلاں دوست اُس سے ناراض ہے تو وہ بلا تکلّف معافی مانگتا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا کرتا ''حضور! میں آپ کا غلام ہوں۔'' 46

عدؔم صاحب سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ وہ ہر آدمی پر بھروسہ کر لیتے۔ اُن کے بعض ملنے

والے اُن سے جھوٹ بولتے مگر وہ اُن پر یقین کر لیتے۔ اگر کبھی کسی نے اُن سے کوئی زیادتی بھی کی تو وہ اُسے دل میں جگہ نہ دیتے بلکہ معاف کر دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:

''انسان کی عظمت دوسروں کی خطائیں معاف کرنے میں ہے۔ دل میں باتیں رکھنا تو گھٹیا لوگوں کا کام ہے۔''47

عدم صاحب واقعی بڑے شاعر بھی تھے اور بڑے انسان بھی۔

عدؔم صاحب نے سکول کے زمانہ ہی میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب عدؔم صاحب کے حوالے سے ہی اُن کی شعر گوئی کے آغاز کے بارے بتاتے ہیں:

''اُن کے ایک عزیز دوست کا انتقال ہو گیا۔ جس کا غالباً عبدالحمید ہی نام تھا۔ یہ اُسے دفن کر کے آئے تو ذہن پر بہت بوجھ تھا اور اِس عالم میں ایک نظم اُس کی موت پر لکھی۔ بس یہیں سے آغاز ہوا اور پھر چل سو چل۔''48

عدؔم صاحب کا اپنا بیان ہے کہ:

''میں سکول کے زمانہ ہی سے شعر کہتا تھا۔ اُن دِنوں اختر شیرانی کی شاعری اپنے عروج پر تھی اور لاہور ہی میں مقیم تھے۔ نوآموز شاعر اُن سے بڑے متأثر تھے۔ میں نے بھی شروع میں کچھ دن اُن سے اصلاح لی۔ میں اُن کا اِتنا گرویدہ تھا کہ اظہارِ محبت کے طور پر شروع میں کچھ عرصہ میرا تخلّص بھی اختر رہا۔ اُنھوں نے مجھے فرمایا کہ تمھاری اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ جب میں نے اُن سے فارغ ہو کر شعر کہنے شروع کیے تو تخلّص بدل کر عدؔم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ علّامہ تاجور نجیب آبادی سے بھی مشورہ لیا لیکن یہ سلسلہ بھی کوئی زیادہ دن نہ چلا۔''49

چونکہ عدم صاحب کے زندگی میں صرف کام ہی یہ تھے کہ دفتر جاتے ہیں، شراب پیتے ہیں، شعر کہتے ہیں۔ شعر سے اُن کے لگاؤ بارے سید ضمیر جعفری کا کہنا ہے کہ:

''شاعری کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی لو لگی رہتی تھی۔ ہم نے پورے عدم کو کسی بیرونی کام کی طرف صدقِ دل سے کاملاً متوجّہ نہیں دیکھا۔ آدھا عدؔم آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آدھا کسی غزل کے لیے نئی زمین کی تلاش میں خدا معلوم کہاں غائب ہے۔ شیو بناتے ہوئے

ایک ہاتھ سے چہرے پر صابن بچھ رہا ہے لیکن دوسرے ہاتھ سے اپنے اندر کسی تازہ شعر پر اُسترا پھیر رہے ہیں۔" 50

عدم پیدائشی شاعر تھا۔ وہ شاعر تھا اور صرف شاعر تھا۔ اس لیے وہ لا اُبالی پن اور زُود گوئی کے باوجود بڑے غزل گو شعراء کی فہرست میں نمایاں ہے۔ عدؔم صاحب کی پہلی کتاب "نقشِ دوام" 1934ء میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کی اشاعت کی کہانی فارغ بخاری صاحب نے اپنے خاکے "پیرِ مغاں" میں بیان کی ہے اور عدم صاحب نے یہ تمام قصّہ اپنی زبان سے بھی خلش ہمدانی صاحب کو سنایا ہے۔ عدؔم صاحب بیان کرتے ہیں:

"علاّمہ تاجور صاحب ایک ادبی پرچے کے ایڈیٹر تھے اور اُنھی دِنوں اُنھوں نے دارالاشاعت کے نام سے ادبی اور علمی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی شروع کیا تھا۔ مجھے اُنھوں نے آمادہ کر لیا کہ میں اپنی کتاب شائع کرواؤں۔ پیسے میرے پاس تھے نہیں کہ کتاب چھپتی۔ علاّمہ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ چھ ماہ میں ہی یہ لگائی گئی رقم مع منافع کے وہ مجھے لوٹا دیں گے۔ میرے پاس رقم نہ تھی۔ میں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر کتاب کا مسوّدہ اور رقم علاّمہ صاحب کے حوالے کر دی۔ علاّمہ صاحب نے میری پہلی کتاب "نقشِ دوام" کے نام سے جلد ہی شائع کر دی۔ اِس کتاب کو پورے ہندوستان میں بہت پذیرائی ملی۔ میں نے چھ ماہ تک رقم کی واپسی کا انتظار کیا۔ چھ ماہ گزر گئے، ایک سال گزر گیا، علاّمہ صاحب نے نہ تو اصل زر لوٹایا اور نہ ہی کتاب سے حاصل شدہ منافع میں میرا حصّہ۔ تقاضے کرتا کرتا میں آخر کار چپ ہو گیا۔ اس کے بعد علاّمہ صاحب سے میرے مراسم ختم ہو گئے۔ اصلاح کا سلسلہ تو پہلے ختم ہو چکا تھا، اِس واقعہ کے بعد اُن سے ملنا جُلنا بھی بتدریج کم ہوتا گیا۔" 51

اِس کے علاوہ دیگر ناشرین نے اُن کا کس قدر اور کس طرح استحصال کیا، اس کا بھی عدم صاحب نے تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح ایک پبلشر نے اُنھیں اغوا کر کے تین دن محبوس رکھا اور جب تک وہیں رہ کر دو کتابوں کے لیے تازہ کلام کا مواد تیار نہ ہوا، اُنھیں رِہائی نہ ملی۔ 52

حقیقت یہ ہے کہ عدمؔ کا نام بِکتا تھا اور پبلشرز اس سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے تھے۔ رائلٹی کی بجائے سو، دوسو روپے میں کتاب کے حقوق خرید لیتے۔ پبلشروں کے ''شر'' اپنی جگہ، اس میں عدمؔ صاحب کے لااُبالی پن اور بے نیازی کا بھی پورا حصّہ ہے۔ اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

''عدمؔ صاحب کتابوں کے معاوضہ کے معاملے میں بھی زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح بے نیاز اور قانع تھے۔ اُن کی روزمرّہ کی سب سے اہم ترین ضرورت گُل فام تھی۔ اُنھیں پبلشرز کتاب کے معاوضے کے طور پر جو کچھ دے جاتا وہ اُسے فوراً قبول کر لیتے اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیتے۔ ستم ظریفی کی بات ہے کہ یہ معاہدہ عین عالمِ سرمستی و رندگی کے دوران طے پاتا۔ اُس وقت عدم صاحب ایک بوتل کے عوض اپنا پورا دیوان بیچ دینے کے موڈ میں ہوتے۔'' 53

یہ معصوم اور سادہ انسان ناشرین سے لُٹتا رہا، دوستوں سے دھوکہ کھاتا رہا، مگر انسان کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتا رہا۔ ایسے خواب جو گیتوں سے زیادہ میٹھے اور شبنم سے زیادہ دلکش ہوتے تھے۔ اُن کے پاس رسیلے قہقہے تھے، نغمے تھے، رنگین اشعار تھے۔ بہار ہی بہار۔ بقول قمر یورش:

''وہ اِس پھیکی اور کھوکھلی اور بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے، نغموں کے، شعروں کے رنگا رنگ پھول کھلاتا اور خوش ہوتا رہا۔ وہ دغا کھا کر بھی سب پر جاں نثار کرتا رہا اور اپنے شاداب ہونٹوں پر ایک پُرنور مسکراہٹ لا کر دوستوں سے کہتا ''حضور! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک یہ غلام زندہ ہے۔'' 54

اِس سادہ لوح، کھرے، سچے، انسانیت کے داعی، انسانوں کے ہم درد اور دوست نواز شخص کی زندگی کے آخری سال کچھ اچھے نہیں گزرے۔ ہر وقت دوستوں میں گھرا رہنے والا عدمؔ اب بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ عدمؔ صاحب کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد کشور ناہید صاحبہ یوسف کامران کے ہمراہ، اُنھیں ملنے اُن کے گھر گئیں۔ اِس واقعہ کو وہ یوں بیان کرتی ہیں:

''عدمؔ صاحب کو ریٹائر ہوئے کافی مُدّت ہو گئی تھی۔ ہم نے سوچا چلو آج عدمؔ کو دیکھ آئیں۔ اُن کے گھر پہنچے تو ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ بڑھی ہوئی داڑھی، ہاتھوں کے بڑھے ناخن۔۔۔۔۔ یوسف بازار سے نیل کٹر لائے۔ میں نے اُن کے ناخن کاٹے۔''

خاندان والوں میں سے کوئی بھی تو ہم کو ملنے نہ آیا۔'' 55

کشور ناہید صاحبہ کو شِکوہ ہے کہ خاندان والوں میں سے کوئی بھی اُنھیں ملنے نہیں آیا۔ خاندان والے کیسے ملنے آتے؟ وہ تو ان ملاقاتوں کے ویسے ہی سخت خلاف تھے اور اُنھوں نے عدم صاحب پر بھی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ خلش ہمدانی صاحب ایک طویل مُدّت کے بعد عدم صاحب سے اپنی ملاقاتوں اور عدم صاحب کی ذہنی اور جسمانی حالت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے ہیں۔ ایک طویل مُدّت کے بعد جلال دین ٹرسٹ ہسپتال بلڈنگ، چوک اُردو بازار لاہور میں خلش صاحب کی عدم سے اچانک ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا حال اور عدم صاحب کی زندگی کے مسائل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اُنھوں (عدم صاحب) نے بتایا کہ میں اب ریٹائر ہو گیا ہوں۔ لاہور میں میرے بیٹوں نے ایک پلاٹ لے کر مکان بنالیا ہے۔ میں اب وہاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں اور میرے گھر والوں نے میرے دوستوں سے ملنے ملانے اور پینے پلانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اوّل تو مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے، اگر کبھی منت سماجت کے بعد اجازت دے دیں تو ایک ملازم کو میرے ساتھ بھیج دیتے ہیں اور اُسے گھر والوں نے سختی سے یہ ہدایت دے رکھی ہے کہ یہ ہر جگہ میری کڑی نگرانی کرے کہ میں دوبارہ پینے پلانے کا سلسلہ شروع نہ کر دوں۔۔۔۔۔ خلش صاحب حضور! اب ایک طرح کی بے مقصد زندگی گزار رہا ہوں اور موت کا انتظار کر رہا ہوں۔'' 56

خلش صاحب کو یہ باتیں عدم صاحب نے اپنی زبان سے بتائی ہیں کہ کس طرح گھر والوں نے اُن پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور کس طرح اُن کی نگرانی کی جارہی ہے۔ اور اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے خلش ہمدانی صاحب بتاتے ہیں کہ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے ہوئے عدم صاحب مجھ سے کہنے لگے:

''دیکھو خلش صاحب! اب مجھ پر اِتنی پابندیاں ہیں کہ جب میرے گھر والوں کو یہ پتہ چلے کہ مجھ سے ملنے میرا کوئی پرانا دوست آیا ہے تو وہ مجھے اُس سے بالکل نہیں ملنے دیتے۔۔۔۔۔ خلش صاحب حضور! اب میری کیا زندگی ہے۔۔۔۔ چارپائی پر پڑا ایک بے جان لاشہ ہوں۔ مجھ پر تو موت اُسی دن واقع ہو گئی تھی جس دن اِس ظالم سماج نے میرے ہاتھ سے جام چھین لیا اور پھر اِس طرح میرے لرزتے ہاتھوں سے میرا قلم گر گیا۔'' 57

عدم صاحب نے زندگی کا طویل سفر، مے کدے کی راہ پر چلتے ہوئے طے کیا۔ مے کدے کا در بند ہوا تو اُنھوں نے بھی رختِ سفر باندھ لیا اور 10۔ مارچ، 1981ء کو اِس دُنیا سے مُنہ موڑ گئے اور لاہور چھاؤنی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ اُن کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اے حمید صاحب لکھتے ہیں:

> ''آخر کار چلتی پھرتی سادگی اور معصومیت کا پیکر عدؔم، لاہور کی محفلوں سے اُٹھ گیا۔ شعر اور زندگی میں عدؔم کی مثال ایک غیر منافق سچے انسان کی مثال تھی۔ نہ شعر میں تکلّف، نہ لہجے میں نہ زندگی میں۔۔۔۔۔۔ جیسا اُن کا دل بے ریا اور معصوم تھا، ویسی ہی اُن کی شخصیت ریا کاری اور منافقت سے پاک تھی۔'' 58

مزاج کی نرمی، خوب صورت گفتگو، احباب نوازی، انسان دوستی، لا اُبالی پن اور بوالعجبیوں کا مجموعہ، مگر خلوص کا پیکر۔ حضور! یہ تھے عدم!

حواشی

1۔ خودنوشت۔مشمولہ فنون جدید غزل نمبر جلد دوم، جنوری، 1969ء، لاہور، ص:1631

حمیر ہاشمی صاحب نے عدم کی جائے پیدائش 'تلونڈی موسیٰ خاں' بتائی ہے۔

حمیر ہاشمی و دیگر ''لاہور میں دفن خزینے' علم و عرفان پبلشرز لاہور، 1988ء، ص:241

عدؔم صاحب کا اپنا بیان دیکھا جائے تو یہ صحیح نہیں ہے۔عدؔم صاحب کے اپنے بقول اُن کی جائے پیدائش لائل پور ہے۔

2۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی''۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 189

3۔ حمیر ہاشمی ''لاہور میں دفن خزینے''۔ علم و عرفان پبلشرز لاہور، 1988ء، ص:241

4۔ اکمل علیمی ''لاہور کے اہلِ قلم''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2014ء، ص: 46

5۔ شاد امرتسری ''سید عبدالحمید عدؔم''۔مشمولہ نقوش 'شخصیات نمبر' جلد دوم لاہور، ص: 1139

6۔ عدؔم ''خودنوشت''، مشمولہ فنون، جدید غزل نمبر، جلد دوم، ص: 1631

7۔ حزیں کاشمیری ''کہاں گئے وہ لوگ''، اُردو کتاب گھر لاہور، 2005ء، ص: 418

8۔ اے حمید ''چاند چہرے''، القریش لاہور، 1995ء، مشمولہ ''اُردو کے شاہکار خاکے، مرتب خلیل احمد فکشن ہاؤس لاہور، 2017ء، جلد اوّل، ص: 701

9۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، سن، ن، ص: 125

10۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، سن، ن، ص: 129

11۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، سن، ن، ص: 130

12۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''، ناشر حافظ سراج الحق لاہور، 1999ء، ص:75,74

13۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، سن، ن، ص: 126

14۔ صادق نسیم ''روشنی چراغوں کی''، عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد، 2003ء، ص: 213

15۔ کشور ناہید ''مٹھی بھر یادیں''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2005ء، ص: 134

16۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''، ناشر حافظ سراج الحق لاہور، 1999ء، ص: 75
17۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 17,16
18۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''، ناشر حافظ سراج الحق لاہور، 1999ء، ص: 74
19۔ اے حمید ''چاند چہرے''، القریش لاہور، 1995ء، مشمولہ ''اُردو کے شاہکار خاکے، مرتب خلیل احمد
فکشن ہاؤس لاہور، 2017ء، جلد اوّل، ص: 714
20۔ اسرار زیدی ''بام و در جن سے روشن ہوئے''، مقبول اکیڈمی لاہور، 2007ء، ص: 95
21۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 186
22۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 187,186
23۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''درشن جھروکہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2009ء، ص: 18
24۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''درشن جھروکہ''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2009ء، ص: 19
25۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 188
26۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 82
اپنے ایک اخلاقی جرم میں شاہدہ جیل چلی گئی۔ عدم صاحب اُس کی ضمانت کی کوشش کرتے رہے۔
تفصیل خلش ہمدانی صاحب کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔
27۔ خلش ہمدانی ''عبدالحمید عدم، نجی و مجلسی زندگی'' ۔کلاسیک لاہور، 1994ء، ص: 82
28 شاد امرتسری ''سید عبدالحمید عدمؔ'' ۔مشمولہ نقوش 'شخصیات نمبر' جلد دوم لاہور، ص: 1140
29۔ اے حمید ''چاند چہرے''، ''اُردو کے شاہکار خاکے''، جلد اوّل، ص: 706
30۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، س ن، ص: 126
31۔ اسرار زیدی ''بام و در جن سے روشن ہوئے''، مقبول اکیڈمی لاہور، 2007ء، ص: 96
32۔ فارغ بخاری ''دوسرا البم'' آئینۂ ادب لاہور، س ن، ص: 151
33۔ شاد امرتسری ''سید عبدالحمید عدمؔ'' ۔مشمولہ نقوش 'شخصیات نمبر' جلد دوم لاہور، ص: 1137
34۔ شاد امرتسری ''سید عبدالحمید عدمؔ'' ۔مشمولہ نقوش 'شخصیات نمبر' جلد دوم لاہور، ص: 1141
35۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''، ناشر حافظ سراج الحق لاہور، 1999ء، ص: 74
36۔ قمر یورش ''یارانِ مے کدہ''، عوامی پبلشرز لاہور، 1983ء، ص: 84
37۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی، س ن، ص: 127

38۔ قمر یورش ''یارانِ مے کدہ''،عوامی پبلشرز لاہور،1983ء، ص: 84
39۔ شاد امر تسری ''سید عبدالحمید عدمؔ''۔مشمولہ نقوش' شخصیات نمبر' جلد دوم لاہور،ص: 1139
40۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی،سن،ن،ص: 127
41۔ فارغ بخاری ''دوسرا البم'' آئینۂ ادب لاہور،سن،ن، ص: 159
42۔ شاد امر تسری،''نقوش،شخصیات نمبر''،جلد دوم، ص: 1141
43۔ اے حمید''چاند چہرے''، 'اُردو کے شاہکار خاکے'،جلد اوّل، ص: 700
44۔ اے حمید''چاند چہرے''، 'اُردو کے شاہکار خاکے'،جلد اوّل، ص: 704
45۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''ص: 76
46۔ حافظ لدھیانوی ''متاعِ گم گشتہ''ص: 82
47۔ خلش ہمدانی''عبدالحمید عدم،نجی و مجلسی زندگی''،ص: 17
48۔ ڈاکٹر سلیم اختر''درشن جھروکہ''،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور،2009ء، ص: 21
49۔ خلش ہمدانی''عبدالحمید عدم،نجی و مجلسی زندگی''،ص: 189
50۔ سیّد ضمیر جعفری ''کتابی چہرے''، نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی،سن،ن،ص: 125,124
51۔ خلش ہمدانی''عبدالحمید عدم،نجی و مجلسی زندگی''،ص: 189،190
52۔ تفصیل کے لیے خلش ہمدانی صاحب کی کتاب''عبدالحمید عدمؔ،نجی و مجلسی زندگی'' کے صفحات 189 تا 195 دیکھے جاسکتے ہیں۔
53۔ اے حمید''چاند چہرے''، 'اُردو کے شاہکار خاکے'،جلد اوّل، ص: 704
54۔ قمر یورش ''یارانِ مے کدہ''،عوامی پبلشرز لاہور،1983ء، ص: 89
55۔ کشور ناہید ''مٹھی بھر یادیں''، ص: 135،136
56۔ خلش ہمدانی''عبدالحمید عدم،نجی و مجلسی زندگی''،ص: 198
57۔ خلش ہمدانی''عبدالحمید عدم،نجی و مجلسی زندگی''،ص: 200
58۔ اے حمید''چاند چہرے''، 'اُردو کے شاہکار خاکے'،جلد اوّل، ص: 715

خاکے

سیّد عبدالحمید عدمؔ

یہ ہیں عدمؔ صاحب

اے حمید

سیّد عبدالحمید عدمؔ

سید عبدالحمید عدم سے میری پہلی ملاقات شروع سن 1948ء میں ''سویرا'' کے دفتر میں ہوئی۔
عدم صاحب کا یہ وہ زمانہ تھا جب وہ گوشہ نشینی کے ایک طویل وقفے کے بعد ادب کی دُنیا میں دوسری بار نمودار ہوئے تھے۔ اپنی اِس آمد کے بارے میں اُنھوں نے ایک شعر بھی کہا تھا:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

عرب ہوٹل کی محفلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اختر شیرانی ساغر و مینا کی بساط سمیٹ چکے تھے اور اُن کی جگہ عدمؔ صاحب نے سنبھال لی تھی۔ ہم سکول کے زمانے میں عدمؔ کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ چھوٹی بحر میں وہ بے ساختہ شعر کہتے تھے۔ اُن کے شعر زیادہ تر مے و ساغر کے بارے میں ہوتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں نے افسانے لکھنے شروع کیے تو عدمؔ صاحب بھی میرے نام سے آشنا ہو گئے۔ اُن کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات اچھی طرح یاد ہے۔ میں بیرون لوہاری دروازے ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھا اپنی افسانوں کی کتاب ''منزل منزل'' کی کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ رسالہ ''سویرا'' کے ایڈیٹر اور مالک نذیر احمد چودھری بھی میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اِتنے میں اُس زمانے کی ایک پرانی کار کھڑکھڑ کرتی دفتر کے سامنے آ کر رُکی۔

چوہدری نذیر صاحب نے کہا: ''عدم آیا ہے۔''

میں نے ایک اونچے لمبے بھاری بدن کے آدمی کو جس نے سوٹ پہن رکھا تھا کار سے باہر نکلتے دیکھا۔ یہ عدمؔ صاحب تھے۔ عدمؔ نے دور سے دونوں بازو کھول دیئے اور بلند آواز میں کہا:

''چوہدری صاحب! میں آ گیا ہوں۔ اب آپ بھاگ نہیں سکتے۔''

عدؔم صاحب دفتر میں آئے تو چوہدری نذیر صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ عدؔم صاحب نے میری طرف چونک کر دیکھا اور بولے:

''اوہو ہو ہو۔ یہ اے حمید ہے۔ میرا فیورٹ رائٹر! آ جا اے خوب صورت نوجوان میرے گلے لگ جا۔''

عدؔم صاحب اُن دِنوں اگر میں بھول نہیں رہا تو جہلم ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ہوتے تھے۔ عدؔم صاحب نے مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا:

''یار تم نے ''حاتم طائی لاہور میں'' بڑے کمال کا مضمون لکھا ہے۔ اوہو ہو ہو۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے تم سے متأثر ہو کر حاتم طائی کے ماڈرن سفر پر ایک ناول شروع کر دیا ہے۔''

میں نے جواب میں کہا:

''ڈاکٹر شفیق الرحمٰن نے مجھے خط لکھ کر بتا دیا تھا کہ وہ میرے حاتم طالی والے مضمون سے متأثر ہو کر اسی طرز پر ایک مزاحیہ ناول لکھ رہے ہیں۔''

عدؔم صاحب نے گردن ٹیڑھی کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر آغوش میں لے لیا اور ہنس کر کہا:

''یار! وہ بھی کمال کا رائٹر ہے۔''

مجھے عدم کی طبیعت بڑی پسند آئی۔ جیسے بے ساختہ شعر کہتا تھا ویسی ہی بے ساختگی اُس کی شخصیت اور سبھاؤ میں تھی۔ نہ کوئی تکلّف نہ کوئی بناوٹ۔ لباس میں بھی اُس کی طبیعت اور مزاج کا لا اُبالی پن جھلکتا تھا۔ اگرچہ اُس نے ٹھنڈا سوٹ پہن رکھا تھا مگر ٹائی کی گرہ کھلی ہوئی تھی۔ سگریٹ مٹھی میں لے کر لمبے سُوٹے لگا رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا اور اُس کا رنگ اور سُرخ ہو جاتا۔ عدؔم صاحب کچھ دیر ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ چوہدری نذیر صاحب نے چائے کا پوچھا تو سگریٹ کا لمبا کش لگا کر عدؔم صاحب نے کہا: حضور!

عدم فقیرِ خرابات ہو گیا ہوں میں
اگر اِس چمن کے علاوہ کہیں بہار نہیں

یہ سرسری سی پہلی ملاقات تھی۔ عدم صاحب گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد وہ جہلم

سے اکثر و بیشتر لاہور آتے رہتے اور اُن سے گاہے گاہے ملاقات ہو جاتی۔لیکن یہ ملاقاتیں مختصر ہوتی تھیں۔ایک بار کافی ہاؤس کے باہر ملے۔تانگے سے بمشکل اُتر رہے تھے۔میں کافی ہاؤس کی سیڑھیاں اُتر کر آگے بڑھا۔میں نے اُنھیں سہارا دیا تو میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور یہ شعر پڑھا: حضور!

ہلکا ہلکا سرور ہے ساقی!
بات کوئی ضرور ہے ساقی!

''حضور'' عدؔم صاحب کا تکیہ کلام تھا۔اُس وقت بھی عدؔم صاحب ہلکے ہلکے سرور میں تھے۔ اُن دِنوں اُن کی صحت بڑی اچھی تھی۔چہرہ لال سُرخ تھا۔بدن بھرا بھرا تھا۔میرا تجربہ ہے اور مشاہدہ بھی ہے کہ عام طور پر شراب بُرے آدمی کو مزید بُرا اور شریف آدمی کو یعنی رحم دل آدمی کو زیادہ رحم دل بنا دیتی ہے۔عدؔم صاحب کے پاس شراب بھی بڑی شریف زادی بن کر آتی اور عدؔم صاحب زیادہ معصوم اور بھولے بھالے ہو جاتے تھے۔

طبعاً عدؔم صاحب بڑے بھولے اور معصوم تھے۔کوئی بھی اُنھیں ٹھگ سکتا تھا۔وہ ملٹری اکاؤنٹس میں بڑے ذمہ دار افسر تھے اور ساری عمر اُنھوں نے اپنی ڈیوٹی انتہائی ذمے داری اور دیانتداری سے نبھائی۔کئی بار ایسا ہوا کہ ساری رات محفلِ ناؤنوش گرم رہی۔ہم رات کے دو بجے عدؔم صاحب کو اُن کے چھاؤنی والے گھر چھوڑ کر آئے۔تصور میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ شخص دوسرے روز دوپہر تین بجے سے پہلے سو کر اُٹھے گا۔لیکن یقین کریں اور اِس بات کے عینی گواہ موجود ہیں کہ دوسرے روز عدؔم صاحب ٹھیک آٹھ بجے اپنے آفس میں بیٹھے صوفی حالت میں بڑی ذمہ داری سے کام کر رہے ہوتے تھے۔لیکن یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ابھی تو میری اُن سے دوسری یا تیسری ملاقات ہی تھی اور میں اُن کے پاس کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔یہاں عبداللہ بٹ،مولانا چراغ حسن حسرت،عبداللہ ملک اور دوسرے احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ادب اور سیاست پر باتیں ہو رہی تھیں۔عدؔم صاحب سیاست کی باریکیوں سے واقف نہیں تھے مگر ملکی سیاست پر کوئی نہ کوئی اپنا طنزیہ شعر ضرور سُنا دیتے تھے جس پر ساری محفل واہ واہ کر اُٹھتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد عدؔم صاحب کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔

اب لاہور میں اُن کی زندگی کا آخری اور بھرپور دَور شروع ہوتا ہے۔ اِس دوران سعادت حسن منٹو بھی بمبئی سے پاکستان واپس آچکے تھے اور لاہور میں مقیم تھے۔ یہ لوگ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں شاذ و نادر ہی آتے تھے۔ منٹو صاحب زیادہ تر ''سویرا'' کے دفتر بیرون لوہاری دروازے یا اپنے ریگل سینما والے فلم کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ عدؔم صاحب دن کے وقت دفتر میں اپنی ڈیوٹی دیتے۔ جیسے ہی سورج غروب ہوتا اور شام کے سائے لاہور شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں پر اُترنے لگتے تو عدؔم صاحب بھی چھاؤنی سے چل پڑتے۔ وہ سیدھا شادامرتسری کے گھر آتے۔ باہر ہی سے آواز دیتے۔

''حضور! نیچے آجاؤ۔''

اگر شاد امرتسری گھر پر نہ ہوتا تو وہ اسی تانگے میں بیٹھ کر رائل پارک میں فلمی ہفت روزہ ''سکرین لائٹ'' کے دفتر میں آجاتے۔ ''سکرین لائٹ'' کا مالک اور مدیر ہمارا دوست غفور بٹ ہوا کرتا تھا۔ بالکل پہلوان تھا۔ ہم اُسے پہلوانِ صحافت کہا کرتے تھے۔ دوستوں کا دوست، دشمنوں کا دشمن، باغ و بہار طبیعت والا۔ اُس کی اسی باغ و بہار اور دوست نواز شخصیت کی وجہ سے ''سکرین لائٹ'' کے دفتر میں اُردو ادب کی مشہور شخصیتیں وہاں آیا کرتی تھیں۔ سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، منیر نیازی، شاد امرتسری، حبیب جالب، ریاض شاہد، نواز، یوسف کامران، فلم آرٹسٹ علاؤالدین، فلمی شاعر خواجہ پرویز وغیرہ۔ اِس فلمی رسالے کا دفتر رائل پارک کی ایک بلڈنگ کے تہہ خانے میں تھا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے جانا پڑتا تھا۔ شام کے وقت یہاں محفل لگتی۔ ہر مے خوار اپنی اپنی شراب لے کر وہاں پہنچ جاتا۔ میں نے نئی نئی شراب پینی شروع کی تھی۔ میں بھی اپنا کواٹر لے کر آجاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ رسالے کے لیے وہیں مضمون لکھتا اور اُس کا معاوضہ پندرہ روپے وصول کر کے منشی سے کہتا کہ فوراً چودہ روپے کا کواٹر اور ایک پیکٹ کیپسٹن سگریٹ کا لے آئے۔ ابھی شراب کی بندش نہیں ہوئی تھی اور پرمٹ پر شراب ملتی تھی مگر سب جگہوں پر ہماری واقفیت تھی اور ہم بغیر پرمٹ کے بھی اپنا کوٹا لے لیا کرتے تھے۔ کچھ دوستوں نے پرمٹ بنوا رکھے تھے۔ کبھی اُن کے پرمٹ پر شراب منگوائی جاتی۔ دفتر کا ملازم منشی گلاس چمکا کر میز پر سجا دیتا۔ بوتلوں کے مُنہ کُھل جاتے اور پھر لطیفہ بازی اور شعر و شاعری کا دَور شروع ہو جاتا۔ بھرپور کیفیت میں آکر بھی کبھی کسی کی زبان سے فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ کسی کی غیبت نہیں کی جاتی تھی۔ کسی کو کوئی

اچھا نہیں لگتا تھا تو اُس کے مُنہ پر کہہ دیا جاتا کہ یار تم مجھے اچھے نہیں لگتے۔ تم بڑے منافق آدمی ہو۔ اب اِس پر اگر لڑائی ہو جائے تو ہو جائے، ورنہ کسی کی پیٹھ پیچھے کبھی برائی نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ تر شعر سُنائے جاتے۔ نثر نگار اپنے تازہ افسانوں یا مضامین کی باتیں کرتے۔ اگر اتفاق سے وہاں کوئی فلمی دُنیا سے تعلق رکھنے والی عورت آجاتی تو سب اُس کے ادب کی وجہ سے خاموش ہو جاتے۔ جو بول رہا ہوتا اُس کو دوسرا شرابی اِشارے سے کہتا کہ خاتون آگئی ہے خاموش ہو جاؤ۔

جیسے جیسے رات گزرتی جاتی محفل فروغِ مے سے گلستان ہوتی جاتی۔ اور جب بساطِ مے سمیٹی جاتی تو ہم لوگ تہہ خانے سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ شراب کے معاملے میں ہر کوئی اعتدال سے کام لیتا مگر عدؔم صاحب اکثر اوقات حدِ اعتدال سے آگے نکل جاتے تھے اور پھر ہم اُنھیں سنبھال لیتے۔ اُنھیں چھاؤنی جانا ہوتا تھا۔ اُن کا کوئی نہ کوئی نوجوان مداح ضرور اُن کے ساتھ ہوتا۔ اگر وہ اکیلے ہوتے تو پھر میں اور شاد امرتسری اُنھیں تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑ آتے تھے۔ ابھی عدؔم صاحب نے اپنی کوٹھی نہیں بنوائی تھی اور ملٹری اکاؤنٹس والوں کے فوجی کوارٹروں میں رہتے تھے۔ تانگہ باہر رُکتا۔ ہم عدؔم صاحب کو سہارا دے کر چلاتے برآمدے میں سے گزر کر اُنھیں کمرے کے اندر پہنچا کر واپس آتے۔

ہم دوسرے دن بارہ ایک بجے تک سوئے رہتے مگر عدؔم صاحب صبح ٹھیک آٹھ بجے اپنے دفتر کی میز پر موجود ہوتے تھے۔

عدؔم صاحب کی شاعری کا یہ دوسرا اور بھرپور دَور تھا۔ یعنی اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' کے بعد کا زمانہ تھا۔ جب عدؔم صاحب پوری آن بان کے ساتھ ادبی دُنیا میں واپس آئے تھے اور کمال کی غزلیں کہہ رہے تھے۔ کسی شام کو شاد امرتسری کی بیٹھک میں محفل جمتی۔ وہاں بھی سارے دوست جمع ہو جاتے اور ہر کوئی اپنی اپنی شراب لے کر آتا تھا۔ شاد امرتسری بڑا صفائی پسند اور زبان کا سچا شاعر تھا۔ بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ اُس کا اپنا چار پیگ کا کوٹا مقرر تھا۔ میری طرح وہ بھی اس سے آگے شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ میں اور شاد امرتسری اپنا اپنا کواٹر لے کر بیٹھتے تھے۔ ایک کواٹر میں ساڑھے تین پیگ نکلتے تھے اور یہی ہمارا کوٹا تھا۔ مگر عدؔم صاحب کے لیے پوری بوتل آتی تھی۔ کبھی یہ بوتل اُن کا کوئی نہ کوئی

مداح لے کر آ جاتا اور کبھی وہ خود دُکان سے خرید کر لے آتے۔ اُن کی شہرت کا ستارہ عروج پر تھا۔ ہر شخص اُنھیں جانتا تھا۔ شراب کی دُکان پر جاتے تو لوگ اُن کے گرد جمع ہو جاتے۔ دُکان دار تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوتا کہ عدمؔ صاحب آئے ہیں۔

ریڈیو پاکستان لاہور کا کوئی مشاعرہ عدمؔ صاحب کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں ریڈیو پاکستان لاہور کے ساتھ وابستہ تھا۔ میرے پاس مشاعرے کا پروگرام آیا تو مہینے کے آخری ہفتے اُردو مشاعرہ آ گیا۔ دوسرے شاعروں کے ساتھ عدمؔ صاحب کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ میں نے عدمؔ صاحب کو ٹیلی فون پر بھی تشریف لانے کی تاکید کی تو اُنھوں نے اپنے خاص انداز میں جواب دیا:

''حضور! میں پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے کہا: ''میں گاڑی بھیج دوں گا۔''

عدمؔ صاحب نے کبھی گاڑی وغیرہ کا لالچ نہیں کیا تھا۔ وہ اِن تکلفات سے بے نیاز تھے۔ چھاؤنی سے تانگے میں بیٹھ کر بھی چل پڑتے تھے۔ کئی بار سارا سارا دِن تانگہ اُن کے پاس رہتا تھا، مگر میں نے اُنھیں ریڈیو پاکستان کی گاڑی بھیج دی۔ عدمؔ صاحب صوفی حالت میں تھے۔ میں لابی میں شعراء کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ عدمؔ صاحب کو شروع سے ہی گھٹنوں کی تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ سنبھل سنبھل کر چلا کرتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُنھیں سہارا دینا چاہا تو وہ فوراً ایک دم پیچھے ہٹ گئے اور مسکراتے ہوئے کہا:

''حضور! ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی۔''

یہ بڑا کامیاب مشاعرہ تھا۔ وہ تقریباً لاہور کے سبھی شاعروں کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس مشاعرے کی ایک تصویر آج بھی میرے پاس محفوظ پڑی ہے۔ ہم ریڈیو پاکستان کے رسالے کے لیے اپنے فوٹو گرافر سے مشاعرے کی تصویر ضرور اُتروایا کرتے تھے۔ اِس تصویر میں شہرت بخاری، قیوم نظر، ثاقب زیروی، ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور عدم صاحب نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ عدمؔ صاحب مائیک کے آگے بیٹھے اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ یہ بھی ایک یادگار تصویر ہے۔ عدمؔ صاحب کی ایک اور یادگار تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ تصویر سن 1949ء میں ایک ہفتہ وار رسالے کے پیچھے بالکونی میں اُتاری گئی

تھی۔ اِس تصویر میں عدؔم صاحب کے ساتھ میں، قتیل شفائی اور مصور انور جلال شمزا بھی کھڑے ہیں۔

ریڈیو پاکستان کا مشاعرہ جب میں نے ریکارڈ کر لیا تو عدؔم صاحب سٹوڈیو سے باہر نکلے اور میرے کاندھے پر بازو رکھ کر کہا:

''حضور! شامِ غم بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اِس غم کو غلط کرنے کے لیے تہہ خانے والے مَے خانے میں پہنچنا ضروری ہے۔''

عدؔم صاحب کاندھے پر ہاتھ نہیں بلکہ پورا بازو رکھ دیا کرتے تھے۔ اس سے اُن کی محبت، اُن کے دل کا خلوص اور سچائی نمایاں ہوتی تھی۔

عدؔم صاحب کے مداحین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ دوسرے شہروں سے اُن کے مداح اُن سے ملنے آتے تھے اور اکثر مداحین جو اُن کے رمز آشنا ہو جاتے، باہر سے آتے ہوئے اُن کے لیے شراب کی بوتل کا تحفہ ہی لاتے۔ حقیقی معنوں میں عدؔم ایک رندِ مشرب شاعر تھے۔ اُن کی یہ رِندی اور سرمستی اُن کی غزلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اُن کی کوئی غزل ایسی نہیں ملتی جو رِندی، شوخی اور سرمستی کی اس خاص کیفیت سے سرشار نہ ہو۔

''نیا اِدارہ'' لاہور نے عدؔم کے کلام کا دوسرے دور کا مجموعہ ''خرابات'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ ایک طرح سے اُن کے کلام کا انتخاب ہی تھا۔ انتخاب میں سب سے زیادہ مشکل یہ پیش آئی کہ عدؔم صاحب سے لوگ عین حالتِ سرمستی میں پیشگی رقم دے کر اُن کا کلام لے جاتے تھے۔ چونکہ عدؔم صاحب کو درِ مَے خانہ کے طواف کے لیے ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی تھی اِس لیے وہ اُسی وقت نئی کتاب کے لیے معاہدہ کر لیتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی بیشتر غزلیات تقریباً اُن کی ہر کتاب میں موجود ہوتیں۔ یعنی ایک غزل ہر دیوان میں مل جاتی تھی، بلکہ دو ایک بار میرے سامنے ایسا بھی ہوا کہ اُنھوں نے نادانستگی میں ایک کتاب دو تین پبلشروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔ بعد میں مزید غزلیں لکھ کر دیں اور تازہ کلام سے کتاب کو بہت حد تک نئی شکل میں تبدیل کیا۔ ایک اور بات بھی تھی کہ عدؔم صاحب کو یاد نہیں رہتا تھا کہ اُنھوں نے کون سی غزل کس کتاب میں شامل کر دی ہے۔ چونکہ اُن کا کلام بک سٹال پر بہت فروخت ہوتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ کتاب نکل جاتی تھی اِس لیے یہ مسئلہ بار بار پیدا ہوتا تھا۔

میرے سامنے ''نیا اِدارہ'' کے مالک نذیر چودھری نے احمد راہی اور ظہیر کاشمیری کو عدؔم صاحب

کے کلام کا انتخاب کا کام سونپا تھا اور اُنھوں نے اسی پریشانی کا اظہار کیا تھا کہ عدم کی ایک ایک غزل چار چار کتابوں میں چھپی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اِس توارد کو یعنی ایک غزل کے بار بار وارد ہونے کو دُور کرنا پڑے گا۔ اس وقت شاعری کی کتابوں میں صرف فیض، ساحرلدھیانوی اور عدؔم کی کتابیں بھی ہاتھوں ہاتھ بِکتی تھیں۔ بعد میں یہ مقام ساغر صدیقی کے حصّے میں آیا۔ انڈیا میں تو عدم صاحب کی کتابیں دھڑا دھڑ فروخت ہوتیں۔ لاہور میں اُن کی کوئی کتاب چھپتی تو اُس کے فوراً بعد انڈیا میں اس کے ایڈیشن شائع ہونا شروع ہو جاتے۔ عدؔم صاحب کتابوں کے معاوضہ کے معاملے میں بھی زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح بے نیاز اور قانع تھے۔ اُن کی روزمرہ کی سب سے اہم ترین ضرورت مَے گلفام تھی۔ اُنھیں پبلشر کتاب کے معاوضے کے طور پر جو کچھ بھی دے جاتا وہ اسے فوراً قبول کر لیتے اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیتے۔ ستم ظریفی کی بات ہے کہ یہ معاہدہ عین حالتِ سرمستی و رِندی کے دوران طے پاتا۔ اُس وقت عدم صاحب ایک بوتل کے عوض اپنا پورا نیا دیوان بیچ دینے کے موڈ میں ہوتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اُنھیں روپے پیسے کی اِتنی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ ایک تو اُن کا تعلق کھاتے پیتے متمول گھرانے سے تھا دوسرے وہ بڑے اونچے عہدے کے سرکاری افسر تھے اور اُن کی تنخواہ بھی بہت تھی۔ بعد میں اُن کی تنخواہ اگرچہ اُن کی بیگم کو ملنے لگی تھی، پھر بھی عدم صاحب کو میرے مشاہدے کے مطابق روپے پیسے کی طرف سے کبھی تنگی نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے سینکڑوں مداح اُن کے ایک اشارے پر سینکڑوں روپے خرچ کرنے پر تیار رہتے تھے۔ مَیں اِس بات کا گواہ ہوں کہ عدؔم صاحب اُس وقت تک اپنے کسی مداح کو پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے جب تک کہ اُن کی جیب میں روپے موجود ہوتے۔ جب اُن کی جیب خالی ہو جاتی تب اُن کے مداح آگے بڑھتے تھے۔ عدؔم صاحب بے حد شاہ خرچ تھے۔ جب وہ تانگے پر بیٹھ کر چھاؤنی سے رائل پارک میں تہہ خانے والے مَے خانے میں آتے تو اُن کے کوٹ کی اندر والی ایک جیب میں بوتل ہوتی اور دوسری جیب نوٹوں سے بھری ہوتی تھی۔ وہ بے دریغ دوسروں پر روپے خرچ کرنے کے عادی تھے۔

عدؔم صاحب سگریٹ مُٹھی میں لے کر زور زور سے کش لگایا کرتے تھے۔ اُن کے کش لگانے کی آواز دُور تک جاتی تھی۔ سگریٹ وہ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ محفل میں بیٹھے ہوئے دوسرے دوستوں

کے لیے بھی منگواتے تھے۔ایک رات کا واقعہ مجھے یاد ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ہم لوگ رائل پارک کے تہہ خانے والے مَے خانے سے خوب پی پلا کر نکلے تھے۔ یہ قیامِ پاکستان کے شروع شروع کا زمانہ تھا۔آبادی اِتنی زیادہ نہیں تھی۔آدھی رات کو میکلوڈ روڈ پر آج کی طرح شور شرابا نہیں ہوتا تھا۔خوش بہار کا موسم تھا۔ بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی جو ہمارے سرُور کو دوبالا کر رہی تھی۔ہم رائل پارک کے ٹیوب ویل والے علاقے سے نکل کر لکشمی میں آگئے۔اچانک عدؔم صاحب بولے:

''حضور! خاکسار کو بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

ہم میں سے کسی نے کہا:

''عدؔم صاحب! اِس وقت یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ریلوے اسٹیشن پر چلتے ہیں۔''

عدؔم صاحب زور سے کھانسے پھر ہنس کر اپنے مخصوص لہجے میں کہا:

''حضور! ریلوے اسٹیشن بہت دور ہے۔یہیں کسی تندور پر بیٹھ جاتے ہیں۔''

آج کل لکشمی چوک میں جہاں بہت بڑا پٹرول پمپ ہے اُن دِنوں وہاں ایک مائی کا تندور ہوا کرتا تھا۔وہ دِن کے وقت وہاں روٹیاں لگایا کرتی تھی اور رات کو بھی وہیں تنور کے پاس ہی سو جاتی تھی۔شاید ابراہیم جلیس نے کہا:

''عدؔم صاحب! مجھے یاد آگیا۔ایک مصرع ہو گیا ہے۔

''اِس جگہ اِیک تنور ہے ساقی''

''چلیے تنور پر چلتے ہیں۔وہاں کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔''

تنور والی مائی اپنا سودا بیچ باچ کر سو رہی تھی۔ہم نے اُسے جگایا۔وہ بے چاری آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی۔عدم صاحب نے کہا:

''اے خاتونِ مشرق! ہمیں سخت بھوک لگی ہے۔کچھ کھانے کو ہے تو عطا کر دیں۔''

تنور والی بوڑھی عورت تھی، کہنے لگی:

''اِس وقت دو چار روٹیاں ہی مل سکتی ہیں۔دال وغیرہ کچھ نہیں ہے۔''

عدمؔ صاحب نے برجستہ کہا:

''حضور! یہی کافی ہے۔''

ہم میں سے کسی کو بھوک نہیں تھی۔ تہہ خانے میں بہت کچھ کھا کر آئے تھے۔ عدمؔ صاحب کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ شغلِ مے کے دَوران کھاتے کچھ نہیں تھے۔ بس یونہی ذرا سی کوئی چیز اُٹھا کر کھالی۔ اُن کی زیادہ توجہ مے کشی کی طرف ہی رہتی تھی۔ چنانچہ بعد میں اُنھیں سخت بھوک لگ جاتی تھی۔

ہم لوگ وہیں چوک لکشمی والے تنور پر بیٹھ گئے۔ عدم صاحب نے دیکھتے دیکھتے ساری روٹیاں ختم کردیں۔ میرا خیال ہے کہ چھ سات روٹیاں تھیں۔ وہ بغیر سالن کے ساری روٹیاں کھا گئے۔ ساتھ ساتھ وہ ہنس ہنس کر باتیں بھی کیے جارہے تھے۔ فقرہ بازیاں بھی ہورہی تھیں۔ اس کے بعد عدمؔ صاحب اپنے ایک مداح کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر چھاؤنی کی طرف چل دیے۔

کبھی کبھی بادہ و جام کی محفل ختم ہوتی تو عدم صاحب ترنگ میں آکر اعلان کرتے:

''حضور! شاہی محلّے چلیں گے۔''

وہ کوئی تماش بین یا طوائفوں سے عشق کرنے والے رِندِ شاہد باز نہیں تھے۔ یہ بات اُن کے مزاج کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ شاہی محلّے طوائفوں کا گانا سُننے نہیں بلکہ اُن طوائفوں کی زبان سے اپنی غزل سُننے جاتے تھے۔ اُنھیں صرف اتنا ہی شوق تھا کہ طوائف اُن کے سامنے بیٹھی اُن کی کوئی غزل گا رہی ہو۔ طوائفیں عدمؔ صاحب کی غزلوں پر جان دیتی تھیں۔ شاہی محلے کے کوٹھوں پر بھی عدمؔ کا کلام بے حد مقبول تھا۔ چونکہ کلام صاف، سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آجاتا تھا اور اس کے شعر میں شوخی (اور ظرافت کے پہلو) کے ساتھ ساتھ رِندی اور مستی ہوتی تھی اِس لیے ہیرامنڈی میں اُن کا کلام بہت گایا جاتا۔ گانے والیاں عدم صاحب کی گرویدہ تھیں اور اُن کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم عدمؔ صاحب کے ساتھ کسی طوائف کے کوٹھے پر گئے اور وہاں پہلے سے محفل گرم تھی۔ عدمؔ صاحب تو بے دھڑک داخل ہوجانے کے عادی تھے۔ طوائف نے عدمؔ صاحب کو دیکھتے ہی گانا بند کردیا۔ کھڑی ہوکر تعظیم بجالائی اور جب تک عدمؔ صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نہیں بیٹھے، گانے والی وہیں کھڑی رہی۔ میں عدمؔ صاحب کے ساتھ اکثر شاہی محلّے جایا کرتا تھا۔

ایک رات کی بات ہے، ہم لوگ رائل پارک سے تانگے میں بیٹھ کر شاہی محلّے کی طرف روانہ ہوئے۔ سب پُر باش تھے۔ رات بارہ بجے کا وقت ہوگا، شاہی محلے میں بڑی رونق تھی۔ بند کوٹھوں سے گھنگھروؤں کے چھناکوں اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ عدؔم صاحب نے ایک کوٹھے کے نیچے تانگہ رُکوادیا۔ کوچوان سے کہا:

''بس حضور! یہیں روک لو تانگہ۔ ہماری منزلِ جاناں آگئی ہے۔''

ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تو بائی جی عدؔم صاحب کو دیکھ کر ادب سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مُجرا رُک گیا۔ بائی نے عدؔم صاحب کو جھک کر آداب کہا۔ عدؔم صاحب نے ہنس کر بلکہ خوش ہو کر اپنا یہ شعر پڑھا:

وہ جو تیرے اسیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

ہم لوگ قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ پہلے سے جو دو چار آدمی گانا سُن رہے تھے وہ بھی عدؔم صاحب کو اپنے درمیان پا کر بڑے خوش ہوئے۔ عدم صاحب نے گانے والی سے کہا:

''اے مطربہ خوش آواز! کوئی ہماری غزل سُناؤ۔''

''جو اِرشاد''

اس محلے کی گانے والیوں کو عدؔم صاحب کی دو چار غزلیں از بر ہوتی تھیں۔ بائی جی نے عدؔم کی یہ غزل گانی شروع کی:

پاس رہتا ہے ، دُور رہتا ہے
کوئی دل میں ضرور رہتا ہے
جب سے دیکھا ہے اُن کی آنکھوں کو
ہلکا ہلکا سرُور رہتا ہے
ایسے رہتے ہیں وہ مِرے دل میں
جیسے ظلمت میں نور رہتا ہے

اب عدم کا یہ حال ہے ، ہر وقت

مست رہتا ہے ، چُور رہتا ہے

عدؔم صاحب جھوم رہے تھے۔ساری محفل اُن کے اشعار پر جھوم رہی تھی۔اس خاص غزل کا پورا ماحول بنا ہوا تھا۔جس طرح غزل سرمستی و سرشاری میں ڈوبی ہوئی تھی یہی حالت پوری محفل کی تھی۔

ایک رات شاد امرتسری کے کمرے میں محفل لگی ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب محفل ختم ہوئی تو ہم لوگ لکشمی چوک سے تانگے میں سوار ہو کر منزلِ جاناں کی طرف چل پڑے۔رات کا ایک بج رہا تھا۔شاہی محلّے کے بڑے بازار میں اِتنی رونق نہیں تھی مگر چوباروں میں گانا ہو رہا تھا۔عدؔم صاحب پیرِ مغاں کی طرح آگے آگے تھے اور ہماری راہ نمائی کر رہے تھے۔اُس رات وہ ایک خاص گانے والی سے اپنی پسندیدہ غزل سُنتا چاہتے تھے۔ہم ایک مکان کے سامنے جا کر رُک گئے۔زینے کا دروازہ کھلا تھا۔میں نے عدم سے کہا:

''حضور! کہیں ہم دوسری جگہ تو نہیں آ گئے؟''

عدؔم صاحب نے لہک کر جواب دیا:

''حضور! فکر ہی نہ کریں''

وہ آگے آگے، ہم پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگے۔زینے میں اندھیرا تھا۔ہم سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔اوپر والا دروازہ بند تھا اور اندر سے کنڈی لگی تھی۔اندر مُجرا ہو رہا تھا۔عدؔم صاحب زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔دوسری طرف سے کسی نے دروازہ کھولے بغیر کرخت آواز میں پوچھا:

''کون ہے بھئی؟ اِس وقت نکل جاؤ، کل آنا۔''

عدؔم صاحب نے کہا:

''بائی سے کہو عدؔم صاحب آئے ہیں۔''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔تھوڑی دیر بعد دروازہ آہستہ سے کھلا۔ایک آدمی نے سر آگے کر کے کہا:

''عدؔم صاحب جی! معاف کرنا۔ بائی جی کا سیٹھ آیا ہوا ہے۔ وہ گانا سُن رہا ہے۔ بائی نے کہا ہے کہ آپ اُوپر والے کمرے میں چل کر بیٹھیں، سیٹھ کے جانے کے بعد بلالیں گے۔

عدؔم نے کہا: ''حضور! فکر ہی نہیں۔ ہم اُوپر جا کر بیٹھتے ہیں۔ بس ہمیں پانی کا جگ اور تین گلاس پہنچا دیں۔''

دروازہ بند ہوگیا۔ وہی زینہ تیسری منزل کو بھی جاتا تھا۔ ہم تیسری منزل پر آئے تو وہاں ایک دالان تھا۔ دالان کی ایک جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامنے بھی ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ ہم چھوٹے کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ بائی جی کی خواب گاہ تھی مگر سخت بدنظمی کی حالت میں تھا۔ سنگھار میز پر گرد جمی تھی۔ سنگھار میز کی چیزیں بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ بیڈ پر میلے کچیلے کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ پرانے کپڑے کرسیوں پر بھی پڑے تھے۔ ہم عالمِ سرمستی میں تھے۔ پرانے کپڑوں کو اُٹھا اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکا اور چھوٹی سی تپائی آگے کر کے بیٹھ گئے۔

عدؔم صاحب کو احساس تھا کہ بائی نے اُنھیں اندر بلانے کی بجائے اُوپر والے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ کہنے لگے:

''حضور! یہ جو سیٹھ صاحب ہوتے ہیں یہ بائی جی کو باقاعدہ ماہانہ ادا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار آتے ہیں اور پھر بائی جی کمرہ بند کر کے صرف اُنھی کے لیے مجرا کرتی ہیں۔ یہ اِن لوگوں کی مجبوری ہے حضور! مگر وہ کم بخت ابھی تک پانی کا گلاس اور جگ لے کر نہیں آیا۔''

بوتل تپائی پر رکھ دی گئی جس میں بمشکل دو تین پیگ ہی باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب موڈ میں تھے۔ وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر سامنے پڑی ہوئی بوتل چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔ میں نے کہا:

''شاید دوسرے کمرے میں کوئی نوکر سو رہا ہے اسے جگا کر اُس سے پانی کا جگ اور گلاس مانگتا ہوں۔''

میں دروازہ کھول کر باہر دالان میں نکل آیا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ابھی میں بند کمرے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھا آدمی ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتا باہر نکلا اور دیوار

کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا:

''بھائی صاحب! پانی کا جگ اور ایک گلاس مل جائے گا؟''

وہ آدمی رُک گیا اور میری طرف دیکھے بغیر بولا:

''کون ہو بھئی تم؟''

میں نے ساری بات بیان کی تو اُس نے ہاتھ سے پیچھے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''اندر جھجرے میں پانی ہوگا۔ لے لو جا کر۔''

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ کیا تھا ایک نیم روشن کوٹھڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ چھت کے ساتھ جالے لٹک رہے تھے۔ ایک چارپائی پر بوسیدہ بستر لگا تھا۔ میلی کچیلی رضائی پڑی تھی۔ تکیے پر میل جمی ہوئی تھی۔ کونے میں مٹی کی جھجری رکھی تھی جس کے پاس ہی تانبے کا ایک گلاس چوکی پر اوندھا پڑا تھا۔ میں نے جھجری ہی اُٹھا لی اور گلاس لے کر کوٹھڑی سے باہر نکلنے لگا تو وہ بوڑھا آدمی ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہوا اندر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ نابینا ہے۔ کہنے لگا:

''گلاس مل گیا؟''

میں نے کہا: ''ہاں جی! میں تھوڑی دیر کے لیے جھجری بھی ساتھ ہی لے جا رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں ہم لوگ بیٹھے ہیں۔ دوسرا کوئی گلاس نہیں ہے؟''

بوڑھا دیوار کے سہارے چلتا اپنی چارپائی پر آ کر رضائی لے کر بیٹھ گیا۔ بولا:

''ایک ہی گلاس ہے۔ یہاں صرف میں ہی پڑا رہتا ہوں کوئی نہیں آتا۔ کوئی آئے تو گلاس بھی رکھ لوں۔ جاؤ۔ جو کرنا ہے جا کر کرو۔ خدا تمھیں عقل دے۔''

اس بزرگ کی نصیحتیں سُننے کا وقت مقام نہیں تھا۔ میں جھجری اور گلاس لے کر آیا تو عدمؔ صاحب نے خوش ہو کر نعرہ لگایا:

''حضور! یہ جھجری مجھے دے دیں۔ بس بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے بائی جی آپ کی نوکر ہے، خادم ہے، کنیز ہے۔ سیٹھ کو بھی آج رات ہی آنا تھا۔''

ہم جھجری سے پانی گلاس میں ڈال کر اس میں شراب کا زہر ملا ملا کر باری باری پینے لگے۔

اب میں اسے زہر ہی کہوں گا۔تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم لوگ زہر پی رہے ہیں۔خدا کا شکر ہے کہ مجھے عین وقت پر اِس بات کا علم ہو گیا اور میں ترکِ شراب کے ساتھ اِس زہر سے بچ گیا۔میں تو پہلے بھی یہ زہر تھوڑا تھوڑا پیتا تھا۔مگر عدؔم صاحب بلا نوش تھے۔عمر کے آخری حصّے میں پہنچ کر اُنھوں نے بھی شراب خانہ خراب سے پیچھا چھڑا لیا اور صوفی ہو گئے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کا ہی حوصلہ تھا۔اِس معاملے میں بھی وہ ایک بہادر انسان ثابت ہوئے۔

بہرحال ہم بائی جی کے مکان کی تیسری منزل کے کباڑ خانے میں بیٹھے زہر پیتے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد بائی جی خود اُوپر آئیں اور عدؔم صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ کر معذرت پیش کی اور ہمیں ساتھ لے کر گانے بجانے والے کمرے میں نیچے آ گئیں۔اس وقت رات کے دو ڈھائی کا وقت ہو گا۔مگر بائی جی کا یہ اخلاق تھا کہ اُس نے عدؔم صاحب کے احترام میں ذرا سی بھی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا اظہار نہ کیا اور عدؔم صاحب کے اصرار پر اُن کی پسندیدہ غزل گا کر سُنائی۔وہ غزل یہ تھی:

وہ جو تیرے اسیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں
اے عدم! احتیاط ، لوگوں میں
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

عدؔم صاحب کا کلام کتابی شکل میں چھپتا رہتا تھا۔کتاب کا معاوضہ اُنھیں جو ملتا وہ لے لیتے۔''مکتبۂ اُردو''، ''نیا اِدارہ'' اور ''مکتبۂ جدید'' ایسے مستند اِداروں کی جانب سے اُن کے کلام کا جو مجموعہ چھپتا وہ دیدہ زیب بھی ہوتا، معیاری بھی ہوتا اور کلام کا انتخاب بھی نہایت محنت سے کیا گیا ہوتا تھا۔لیکن عدؔم صاحب چونکہ مشہور شاعر تھے اور اُن کی کتاب بِکتی تھی اِس لیے ایسے پبلشر بھی اُن سے غزلوں کا مسودہ لے جاتے جو مرغی خانے اور گھریلو، معاشرتی یا دستکاری کی کتابیں چھاپتے تھے۔ایسے

پبلشر عام طور پر عدؔم صاحب کے پاس اُس وقت آتے جب وہ رِندی و سرمستی کے عالم میں ہوتے تھے۔ وہ جو معاوضہ دیتے عدؔم صاحب پکڑ کر جیب میں رکھنے کی بجائے وہیں کسی کو آواز دے کر پیرِ مغاں کی دُکان پر بوتل لینے بھیج دیتے۔ عدم صاحب کا دل بڑا کھلا تھا۔ میں اِس کا شاہد ہوں کہ وہ جب محفل سجاتے تو جیب سے سارے پیسے نکال کر میز پر اپنے سامنے رکھ دیتے اور پھر وہیں سے اُٹھا اُٹھا کر خرچ کرتے رہتے۔ میں نے عدؔم صاحب کے پیسے کبھی ختم ہوتے نہیں دیکھے۔ وہ اپنی جیب سے پیتے تھے اور دوسروں کو بھی پلاتے تھے۔ کوئی مداح اگر اُن کے لیے کوئی نذرانہ لے آتا تو وہ اسے بھی ساری محفل میں تقسیم کر دیتے تھے۔

اب مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی میدانِ بلانوشی میں اُتر آئے تھے۔ شروع شروع میں بھی جب منٹو صاحب بمبئی سے نئے نئے لاہور آئے تھے تو شام کے وقت وہ شغلِ مَے کرتے۔ لیکن پھر اُنھوں نے دن کے وقت بھی شغلِ مَے شروع کر دیا۔ اُن کی ایک الگ داستان ہے۔ عدؔم صاحب کے ساتھ منٹو صاحب کی مَے نوشی کی محفلیں شاذ و نادر ہی جمتی تھیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے میدان کے شہسوار تھے اور دونوں کا اپنا اپنا الگ حلقہ تھا۔ لیکن کبھی کبھی دونوں شہسواروں کا ملاپ بھی ہو جاتا۔ پھر نثر اور شعر و شاعری پر جو گفتگو ہوتی وہ سُننے کے لائق بلکہ نوٹ کرنے کے لائق ہوتی تھی۔ اس قسم کی محفل جب عروج پر پہنچتی ہے تو عام طور پر بحث مباحثہ جھگڑے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ مگر جہاں عدم صاحب کا مزاج صلحِ کُل اور امن پسند تھا۔ ادب کے اِن دونوں شہسواروں کی ایک محفل کی یاد میرے ذہن میں روشن ہے۔

یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ ہم لوگ کہاں بیٹھے تھے، یعنی ہماری محفل کہاں لگی تھی۔ محفل ختم ہونے کے بعد کا سارا حال مجھے پوری طرح یاد ہے۔ ہم نے کسی جگہ سے تانگہ کرایا تھا اور تانگہ دن کے وقت ہیرا منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ عدؔم صاحب اور میں تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ کوچوان تانگے کے پائیدان پر بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر دو مشہور شاعر بیٹھے تھے جن کا میں نام نہیں لکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وہ اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کریں گے۔

تانگہ بھاٹی دروازے کے سامنے سے نکل کر ٹکسالی دروازے کی طرف فراٹے بھرتا جا رہا

تھا۔ اُس زمانے میں اِنتارش نہیں ہوتا تھا۔ شراب کی بوتل میں نے اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ ایسا ہوا کہ گھوڑا خدا جانے کیوں اچانک رُک گیا۔ کوچوان نے بہت چابکیں ماریں مگر گھوڑا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ عدم صاحب نے کہا:

"حضور! بے زبان کو نہ مارو۔ اِسے پیاس لگی ہے۔"

یہ کہہ کر عدؔم صاحب نے بوتل مجھ سے لی۔ وہ پہلے ہی کھلی ہوئی تھی۔ بوتل لے کر وہ تانگے سے نیچے اُترے۔ گھوڑے کے پاس گئے اور بوتل اُس کے منہ میں ڈال دی۔ کوچوان چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔

"باؤ جی! یہ کیا کرتے ہیں؟"

"حضور! ابھی دیکھنا ہوا سے باتیں کرنے لگے گا۔"

کوچوان نے عدؔم صاحب کو پیچھے کھینچ لیا۔ لیکن اس اثناء میں جم خانہ شراب کے کم از کم دو ڈبل پیگ گھوڑے کے معدے میں پہنچ چکے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ گردن کو جھاڑا۔ اگلی ٹانگیں زور سے زمین پر ماریں اور پھر جو دوڑا تو ہوا سے باتیں کرتا آن کی آن میں ٹکسالی دروازے کے باہر تھا۔ ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ کوچوان نے بڑی مشکل سے ٹکسالی کے باہر تانگے کو روکا۔ گھوڑا ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ عدؔم صاحب نے تانگے سے اُترتے ہوئے کوچوان سے کہا:

"حضور! اب ہمیں گھوڑے کے واسطے شراب کا پرمٹ بنوانا پڑے گا۔"

یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ بھی کیا زمانہ تھا۔ ٹکسالی کے اندر ایک گلی تھی جہاں ایک ریٹائرڈ مطربہ رہائش پذیر تھی۔ یہ مطربہ بڑی ادب دوست تھی۔ اسے شعر کا بڑا اچھا ذوق تھا اور عدؔم صاحب اور منٹو صاحب کی بڑی مداح تھی۔ گلی میں ایک تین منزلہ مکان تھا جس کے ایک کمرے میں اُس نے الماریوں اور شلفوں میں اُردو شعر و ادب کی کتابیں سجا رکھی تھیں۔ کمرے کو بڑے سلیقے سے سجایا ہوا تھا۔ ہم سب کو دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی۔ فوراً صوفے سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"زہے نصیب کہ ادب کی اتنی بڑی ہستیاں میرے غریب خانے پر آئی ہیں۔ آپ تشریف

رکھیں۔ میں آپ کے لیے چائے کا کہتی ہوں۔''

عدؔم صاحب نے برجستہ کہا:

''چائے ہمارے پاس بوتل میں موجود ہے آپ صرف پانی اور گلاس منگوا دیں۔''

محفل لگ گئی۔ دَور چلنے لگے۔ عدؔم صاحب نے اپنی تازہ غزل سُنائی۔ مجھے اس غزل کا صرف مطلع یاد رہ گیا تھا۔ میں ان کے دیوان میں سے دیکھ کر یہ غزل یہاں درج کر رہا ہوں تا کہ آپ بھی محظوظ ہوں۔

اے دوست! اِک غریب سے اِتنا خفا نہ ہو
شاید تو کل بلائے تو یہ بے نوا نہ ہو

بیٹھا ہے کس خیال میں اے قلبِ نامراد
اُس گھر میں کون آئے گا جس میں دیا نہ ہو

ایسی تو بد لحاظ نہ تھی وہ ستم ظریف
اے زیست! تُو نے موت سے کچھ کہہ دیا نہ ہو

لب جل گئے ہیں تلخیِ صہبائے زیست سے
اے پیرِ مے کدہ! یہ تِری بددُعا نہ ہو

جس چیز سے طلوعِ قیامت مراد ہے
میرے شکستہ شیشۂ دل کی صدا نہ ہو

میری نوا سکوتِ بیاباں کی گونج ہے
اے آبروئے نطق! مِری ہم نوا نہ ہو

دیتا نہیں عدؔم میں جوانی کو بددُعا
اِس خوف سے کہ یہ بھی کسی کی رضا نہ ہو

عدؔم صاحب کی یہ معرکہ آرا غزل اُن کے خاص اُسلوب سے ذرا ہٹ کر تھی اور اس میں فکر کی روشنی بھی کہیں کہیں جھلک رہی تھی۔ بحر کا انتخاب بھی عدؔم نے اپنی پسند کی چھوٹی بحروں کے برخلاف

کیا تھا۔ اِس غزل نے واقعی وہاں ایک سماں باندھ دیا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو سعادت حسن منٹو بھی چپ ہو گئے اور اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے غور سے عدؔم کو تکنے لگے۔ منٹو صاحب بہت ہی کم کسی کو داد دیتے تھے۔ مگر اس وقت مجھے یاد ہے کہ منٹو صاحب کا بھی سر ہل گیا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور مَے خانۂ سوز سے رابطہ رکھنے والوں کا وقت کچھ زیادہ تیزی سے گزرتا ہے۔ عدؔم صاحب کو شروع ہی سے سانس کی تکلیف تھی۔ شراب کے زہر نے اُن کی علالت میں اضافہ کر دیا تھا۔ مگر وہ رِندِ مشرب اور دلیر انسان تھے۔ اپنی علالت کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لائے تھے۔ ''سکرین لائٹ'' اور شادامرتسری کی بیٹھک سے اُٹھ کر اب عدم صاحب نے فلیمنگ روڈ پر ایک ادبی رسالے کے دفتر میں ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ اُن کی محفل دن کے وقت ہی شروع ہو جاتی تھی۔ میں اُن دِنوں فلیمنگ روڈ پر ہی رہتا تھا۔ صبح ریڈیو سٹیشن جاتے ہوئے رسالے کے دفتر کے سامنے سے گزرتا تو ایک نظر اُٹھا کر دفتر کے دروازے کو ضرور دیکھ لیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر عدؔم صاحب نے محفل جمائی ہوئی ہے۔ مگر اُن سے ملے بغیر آگے نکل جاتا۔ اس ادبی رسالے کے دفتر میں عجیب و غریب قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک روز میں ریڈیو سٹیشن جاتے ہوئے وہاں سے گزرا تو اُن عجیب و غریب لوگوں میں سے ایک عجیب و غریب آدمی باہر کھڑا اسنگترے لے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس شخص نے دونوں بازو پھیلا دیے اور نعرہ لگایا:

''آجائیں مولانا! عدؔم صاحب بھی اندر بیٹھے ہیں۔''

وہ کھڑے کھڑے آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے آگے نکل جانے کی کوشش کی مگر اُس عجیب و غریب شخص نے لپک کر مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور دوسرے لمحے میں ایک نیم روشن کمرے میں تھا۔ جہاں ویرانی برس رہی تھی۔ عدؔم صاحب کاپیاں جوڑنے والی بڑی میز کے پاس کرسی پر بیٹھے جھوم رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بازو کھول کر بولے:

''اے حمید خستۂ جاں!

تمھارے ناریل کے جنگل پر ایک شعر ہو گیا ہے۔''

عدؔم صاحب نے اُسی وقت ناریل کے درختوں اور لنکا کی دیوداسیوں کے بارے میں ایک قطعہ کہہ دیا جو صد افسوس کہ میرے ذہن سے اُتر گیا ہے۔ اُنھوں نے میرے بارے میں بھی ایک

رُباعی کہی تھی وہ بھی مجھے یاد نہیں رہی۔

تنگ و تاریک کمرے میں گھٹیا سگریٹ کی بُو کے ساتھ گھٹیا قسم کی شراب کی بد بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میز پر جم خانہ کی بوتل کی بجائے چھوٹی چھوٹی دوائیوں والی دو شیشیاں پڑی تھیں۔ دو تین مٹی کے پیالے بھی تھے جن میں شیشیوں کا زہر بھرا ہوا تھا۔ ایک پلیٹ میں سنگترے کھول کر رکھے ہوئے تھے۔ عدؔم صاحب پیالے کا ایک گھونٹ بھرتے، بڑا بُرا مُنہ بناتے جو کہ پہلے وہ کبھی نہیں بنایا کرتے تھے۔ جلدی سے سنگترے کی ایک پھاڑی مُنہ میں ڈال کر چبانے لگتے۔ اُنھوں نے مجھے بھی دعوت دی مگر مجھے دوائی بلکہ زہر کی شیشی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ عدم صاحب نے زیادہ اصرار نہ کیا مگر وہ عجیب و غریب آدمی بار بار دوائی پیالے میں ڈال کر میرے مُنہ کے پاس لاتا اور عجیب طرح ہنس کر کہتا:

''حضور! تھوڑا پی کر تو دیکھیں۔ چاروں طبق روشن ہو جائیں گے۔''

شیشی میں خدا جانے کون سا زہر تھا کہ عدم صاحب بالکل پتھر بن کر بیٹھے تھے۔ اُن میں وہ شگفتگی غائب تھی جو اُن کی مے نوشی کا خاص حصّہ تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میرا سر چکرانے لگا۔ بس کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل آنے میں کامیاب ہو گیا۔ عدؔم صاحب کے اس دفتر میں بیٹھنے کا مجھے افسوس ہوا کہ اب اُن سے میری ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ جن محفلوں میں ہم بیٹھا کرتے تھے وہ ختم ہو چکی تھیں۔ عدؔم صاحب کے حالات بھی اب وہ نہیں رہے تھے۔ خدا جانے وہ خود اس دفتر میں جا کر بیٹھتے تھے یا وہ عجیب و غریب قسم کے جناتی لوگ اُنھیں پکڑ کر وہاں لے جاتے تھے۔ بہر حال عدؔم صاحب کا ٹھکانہ اب وہی رسالے کا پریشان حال دفتر بن گیا تھا۔

ہفت روزہ ''سکرین لائٹ'' کا دفتر تہہ خانے سے اُٹھ کر چوک لکشمی میں آ گیا تھا۔ ہفتے میں دو ایک بار ہم شام کو وہاں اپنی محفل سجا لیا کرتے تھے۔ ایک رات ہم سب دوست وہاں بیٹھے ہوئے تھے، گرمیوں کا موسم تھا۔ رسالے کے ایڈیٹر غفور بٹ کے پاس ایک پیڈسٹل فین ہوا کرتا تھا جس کے آگے جالی نہیں لگی ہوئی تھی۔ یہ بڑا خطرناک پنکھا تھا اور ہم اسے دروازے کے اندر ایک طرف کر کے چلایا کرتے تھے۔ اُس شام بھی یہ پنکھا بغیر جالی کے چل رہا تھا۔ اچانک عدؔم صاحب جھومتے جھامتے نمودار ہوئے۔

''حضور! میں آ گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اُنھوں نے دروازے کی چوکھٹ کو پکڑنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا اُن کا ہاتھ پنکھے کے پروں میں آ گیا اور عدم صاحب چیخ مار کر وہیں بیٹھ گئے۔ ہم سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ فوراً عدؔم صاحب کو سنبھالا۔ عدؔم صاحب ہاتھ بغل میں دبائے وہیں دروازے میں بیٹھے کراہ رہے تھے۔ غفور بٹ نے منشی کو آواز دے کر کہا:

''اوئے منشی! جلدی سے جم خانے کا کواٹر کھول کر لا۔''

مُنشی اِس قسم کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ اُس نے جلدی سے میز کے نیچے سے کواٹر نکال کر کھولا۔ گلاس بنایا اور عدؔم صاحب کو پیش کیا۔ عدؔم صاحب فوراً آدھا گلاس پی گئے۔ ہمیں یہ فکر پڑی تھی کہ عدؔم صاحب کی اُنگلیاں ضرور اُڑ گئی ہوں گی کیوں کہ اُن کا ہاتھ باقاعدہ پنکھے کے چلتے پروں سے ٹکرایا تھا اور اس کی آواز بھی آئی تھی۔ غفور بٹ نے عدؔم صاحب کا بازو کھینچتے ہوئے کہا:

''حضور! ہاتھ تو دکھائیں''

اور جب عدؔم صاحب نے ہاتھ دکھایا تو وہ بالکل صحیح سالم تھا۔ ایک طرف اُنگلیوں کو ذرا سی خراش ضرور آ گئی تھی۔ ہم سب حیران بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے کہ اللہ نے بڑا فضل کر دیا۔ عدؔم صاحب کی اُنگلیاں بچ گئیں۔ غفور بٹ پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اُس نے اپنے حساب میں جم خانے کا کواٹر کیوں کھلوایا۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا اور اُس نے کہہ ہی دیا۔

''عدؔم صاحب! اِس کواٹر کے عوض آپ کو دو غزلیں رسالے کے لیے دینی ہوں گی۔''

عدؔم صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا:

''حضور! تین غزلیں دوں گا۔''

اُن دِنوں عدم صاحب ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر اپنے چھاؤنی والی نئی کوٹھی میں رہ رہے تھے۔ جب یہ کوٹھی بن کر تیار ہوئی تھی تو عدؔم صاحب مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ بڑی خوب صورت کوٹھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عدؔم صاحب پر ایک یہ کرم بھی کیا تھا کہ اُنھیں نہایت وفا شعار، دُور اندیش اور صابر بیوی اور ہونہار اولاد عطا کر دی تھی۔ بیگم صاحب نے جس بُردباری، تحمّل اور صبر و شکر اور دانش مندی کے ساتھ عدؔم صاحب کا ساتھ نبھایا اور اولاد کی پرورش کی یہ اُنھی کا حصہ ہے۔ بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اُنھیں لائق

بنایا اور وہ عہدوں پر فائز ہوئے اور چھاؤنی میں اپنی عالی شان کوٹھی بنوائی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔عدم صاحب کے درِمیکدہ پر پھیرے کم سے کم ہوتے چلے گئے۔کبھی کبھار کسی ادبی محفل میں اُن سے ملاقات ہوجاتی تو اُنھیں صوفی حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی۔کیونکہ میں خود بھی تائب ہوچکا تھا۔اُن کی سانس کی تکلیف عمر کے ساتھ بڑھ گئی تھی۔معلوم ہوا کہ عدؔم صاحب نے بھی شراب ترک کردی ہے۔وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ایک بار ہم اُن کی عیادت کو اُن کے ہاں گئے۔وہ دُبلے ہو گئے تھے اور اُنھوں نے ڈاڑھی بڑھالی تھی۔کچھ وقت اور گزر گیا۔

لاہور ٹی وی پر عدؔم صاحب کا ایک انٹرویو نشر ہوا۔انٹرویو یوسف کامران لے رہے تھے۔عدؔم صاحب کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہ عدؔم صاحب ہیں جو رِندِ شراب تھے اور جن کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔یوسف کامران کی ہر بات کا جواب بڑی متانت اور سنجیدگی سے دے رہے تھے۔کسی کسی بات پر ذرا سا مسکرا دیتے تھے۔اُن کی مسکراہٹ اُن کے مزاج کی طرح بالکل بچوں ایسی تھی۔

اس کے بعد ایک روز یہ حسرت ناک خبر سُنی کہ لاہور میں طویل علالت کے بعد عدؔم صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔

مِری اجل بھی عدم اِک حسیں بہانہ ہے
غمِ حیات سے آزاد ہو گیا ہوں میں

وہ چلتی پھرتی سادگی اور معصومیت کا پیکر عدؔم لاہور کی محفلوں سے اُٹھ گیا۔شعر اور زندگی میں عدؔم کی مثال ایک غیر منافق اور سچے انسان کی مثال تھی۔ایک لمبی مُدّت مَیں نے اُن کے ساتھ گزاری ہے۔اُنھیں ہر حالت میں دیکھا ہے۔دریا کے اوپر بھی دیکھا ہے اور اُن کے ساتھ غوطہ لگا کر اُنھیں دریا کے اندر بھی دیکھا ہے۔لوگ عدؔم صاحب کو دھوکہ دے جاتے تھے۔اُنھوں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا تھا۔جیسا اُن کا دل بے ریا اور معصوم تھا ویسی ہی اُن کی شخصیت ریاکاری اور منافقت سے پاک تھی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

سیّد ضمیر جعفری

عدم کا وجود

عدؔم کے نئے مجموعے ''زرِ آب'' میں ایک شعر ہے:

قتل کرنے سے پہلے لوگ عدؔم
خواہشوں کو جوان کرتے ہیں

لیکن جہاں تک عدؔم کے اپنے تیوروں کا معاملہ ہے، ان کی خواہشات ہمیشہ جوان بلکہ کم سِن رہیں گی۔ ان کی خواہشوں کے بعض غنچے بن کِھلے مُرجھا سکتے ہیں، لیکن پھول بننے کے بعد ان پر خزاں نہیں آسکتی۔ یہ خود بوڑھے ہو سکتے ہیں، مگر ان کی خواہشوں کی سیندور کبھی مدھم نہ ہو گی۔ زندگی کا جو راستہ عدم نے اختیار کیا ہے ہمیں آدمی خود بڑھاپے کی طرف مگر خواہشات جوانی کی طرف رواں رہتی ہیں۔ آرزوؤں کا یہی الھڑ پن زندگی کا یہی کبھی نہ بجھنے والا شعلہ ہے جس نے ان کی شاعری کو ادب کے وسیع سمندر میں روشنی کا مینار بنا دیا ہے۔ مَیں نے یہ تذکرہ اِس لیے بھی کیا ہے کہ عدؔم سے جب میں پہلی مرتبہ ملا تھا تو آپ اپنی خواہشات کی ''پنیری'' کو جوان کر رہے تھے، بلکہ اپنی طبعی عجلت پسندی کے باعث بعض خواہشات کو وقت سے پہلے جوانی بخش رہے تھے۔ خواہشات بھی ایسے خوابو اور رنگوں سے نکلی اور خوشبوؤں میں لپٹی ہوئیں اور اُن کے اوپر طرح طرح کی شرابیں نچڑی ہوئیں کہ ان کی خواہشات کو دیکھ کر دوسروں کا دم نکل جاتا تھا۔

عدم اُن دِنوں ابھی ایک پرت کے کُھد بدے سے نوجوان تھے اور ملٹری اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کی ملازمت کے سر رشتے سے ہمارے شہر جہلم میں متعین تھے۔ آج ان کی ادبی شہرت میں گہرائی اور اُونچائی بے شک زیادہ ہو گی، لیکن ایک لمبائی اور چوڑائی اُس وقت بھی کچھ کم نہ تھی۔ جوؔش اور عدؔم کے درمیان اگرچہ ایک پوری نسل کا فاصلہ حائل تھا، لیکن عمروں کی فراواں تفاوت کے باوجود صورتِ حال

کچھ ایسی تھی کہ:

جوشؔ یوپی میں غزل خواں تھا، عدمؔ پنجاب میں

پنجاب میں حفیظؔ اور اخترؔ شیرانی کے بعد جن شاعروں کی دھوم ہم نے اپنی آنکھوں سے مچتی ہوئی دیکھی ہے، اُن میں عدمؔ بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان عبدالحمید عدمؔ نے ابتداء ہی کچھ ایسی گلفام وگلبدن نظموں سے کی تھی کہ ہر نظم میں اُردو شاعری کی ایک نئی صبح طلوع ہوتی دکھائی دیتی۔ ان کے اولیں شعری مجموعے ''نقشِ دوام'' کو جو دلوں میں سما جانے والی قبولیت حاصل ہوئی وہ کسی نوجوان شاعر کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی۔ اُن کے طبع شدہ شعری مجموعوں کی ''مردم شماری'' کا حساب مجھے یاد نہیں لیکن اِتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ''نقشِ دوام'' کی آب و تاب (ممکن ہے آب و تاب اُن کے کسی شعری مجموعے کا نام ہو؛) آج تک مدھم نہیں ہوسکی۔ اس کی بانکی، ادبی، اُجلی، ملائم اور ریشمی نظموں کے باطن میں جرأت مندانہ فکر کی ایک گھمبیر جوالا ''بستانِ چراغاں، دیوالی فروزاں'' نظر آتی تھی، اس کی چنک اور چبھن، رنگ اور آہنگ پر پوری شاعری چونک کر اُن کی طرف دیکھنے لگ گئی تھی کہ یہ کون:

یہاں بھی مُنہ اندھیرے آ گیا ہے

عدمؔ کے بزرگوں نے غالباً بر بنائے دُور اندیشی ان کی شادی نوعمری ہی میں ایک نیک سیرت، نیک بخت، صابرہ اور سگھڑ قسم کی بنتِ حوّا سے کردی تھی۔ کچھ ٹھیک سے اب یاد نہیں رہا، لیکن جہلم میں آپ تین چار بچوں کے باپ بن کر وارد ہوئے تھے، جن کو آپ لاڈ سے گھوڑا، شیر اور چیتا وغیرہ کے ناموں سے پکارتے تھے۔ گھوڑا ان میں سب سے بڑا تھا، بازار سے سگریٹ، پان لانے کے لیے دوڑنے بھاگنے کا کام گھوڑے ہی کے سپرد تھا (یہ گھوڑے، شیر اور چیتے خدا کے فضل سے اب نہایت اونچے اور اہم منصبوں پر فائز ہیں)۔

معروف افسانہ نگار اور فلم ساز حفیظ رومانؔی اُن دِنوں وہیں نہر کے محکمے میں ملازم تھے۔ نہر عموماً بند رہتی تھی۔ البتہ رومانؔی چلتے رہتے تھے۔ عدمؔ تک میں اُنھی کے واسطے سے پہنچا۔ اُن دِنوں عدمؔ

کے بیوی بچے راولپنڈی میں تھے اور وہ خود نئے محلے کے ایک پرانے دومنزلہ مکان میں تین چار ہم عمر اور ہم مذاق احباب کے ساتھ گویا ایک چھوٹے سے ہوسٹل میں بُود و باش رکھتے تھے۔ یہ سب نوجوان اُس دور کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح مختلف سرکاری دفتروں میں چھوٹی چھوٹی اسامیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ اگرچہ پیچھے بیوی بچوں کو بھیج دیتے تھے، تاہم زندہ دِلی اور بے فکری کے اعتبار سے اُن کے کنوارپن کا کانچ ابھی ٹوٹنے نہ پایا تھا۔ پاکستان میں یہ سب اصحاب خاصے اُونچے اُونچے عہدوں تک پہنچے۔ اُس وقت اِن لوگوں کے اشغال و اعمال سے اِتنی امید ضرور بندھی تھی کہ اگر خدانخواستہ ملازمت کبھی جاتی رہی تو گا بجا کر روزی کما لیں گے۔ عدؔم نامور شاعر تھے، ملک صاحب پکّی گائیکی میں ایسی زبردست دست گاہ (دست گاہ اِس لیے کہ گاتے وقت وہ ہونٹوں سے زیادہ ہاتھ ہلاتے تھے) رکھتے تھے کہ اُن کو بڑودہ یا پٹیالے میں واقع ہونا چاہیے تھا۔ چوہدری صاحب طبلے کے رُستم اور شیخ صاحب سارنگی وستار کے پرور دِگار تھے۔ اپنے مکینوں کی طبیعت و سرشت کے لحاظ سے یہ ہوسٹل بی۔ ایچ۔ کیو (BACHELOR HEAD QUARTAR) کہلاتا تھا۔ عدؔم صاحب اُن کے ''شاہ بادشاہ'' تھے۔

''شاہ بادشاہ'' دن کو دفتر کی چکی پیستے، البتہ شام کو اُن کی سلطانی کا دَور دَورہ شروع ہوتا جس کو ''فرخندہ شبی'' کے شاعرانہ نام سے یاد کیا جاتا۔ یہ دَور بسا اوقات اگلی صبح تک جاری رہتا۔ ''بی ایچ کیو'' میں دو وقت کی روٹی کی طرح عدؔم کم از کم دو غزلیں (یا نظمیں) عمومًا کہہ لیا کرتے تھے۔ رات کو سوچی ہوئی غزل ناشتے پر اور دفتر میں اُتری ہوئی چیز سہ پہر کی چائے پر احباب کو سنائی جاتی۔ ''بی ایچ کیو'' کے باسی نہ باسی باسی طعام کھاتے نہ باسی کلام سُنتے۔

چائے کے بعد ساز و آواز کی سبھا جم جاتی۔ اب عدؔم کی غزلیں ہارمونیم، ستار، سارنگی اور طبلے کی سنگت میں باقاعدہ گائیکی میں ڈھال کر گائی جاتیں۔

روح پرور نام اور القاب یاد آنے لگے
چاند یاد آنے لگے، مہتاب یاد آنے لگے

اور

وہ رکھ رہے ہیں پاؤں حدودِ شباب میں
محشر کی پَو پھٹی ہے ، خدا کے حساب میں

اور

چاہا ہے جب کہ تیری وفا کا ثبوت دُوں
اپنے خلوص کو بھی ریا کہہ گیا ہوں میں

اور

جو ناداں تھے وہ پھول اب تک ہیں تازہ
جو دُور اندیش تھے ، مُرجھا گئے ہیں

اور پھر جب حمید ملک لمبی بحر کی کسی غزل کو پکڑ کر قوالی کی دُھن میں دُھننے لگتا، مثلاً:

وہ سامنے جب آ جاتے ہیں، یک لخت یہ کیا ہو جاتا ہے
میں دل سے جدا ہو جاتا ہوں، دل مجھ سے جدا ہو جاتا ہے

تو پھر رقصِ بلند آہنگ کی وہ خاص دھما چوکڑی بپا ہو جاتی۔
جسے اربابِ دانش لغزشِ مستانہ کہتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار ''آبِ زر'' میں سے نقل کیے گئے ہیں، لیکن عدؔم کا شعر ابتداء ہی سے تقریباً اسی سطح و مزاج کا ''حرفِ طبیعت زاد'' رہا ہے۔ ان کو پیدائشی قادر الکلام شاعر کہنا چاہیے۔ شراب و شباب کے امتزاج سے جو نظامِ فکر وہ اپنے شعر میں کشید کرتا ہے، جس ''سلیس آنکھ'' سے زندگی کے افکار و حوادث کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس دلیرانہ بلکہ جارحانہ پیش دستی سے حقائق کے چہرے سے گھونگھٹ الٹتا ہے، یہ تمام عوامل ایک واضح جذبے، ایک مخصوص تجربے، ایک لازوال آرزو اور ایک مسلسل ذہنی پس منظر کی صُورت میں عدؔم کی ابتدائی شاعری میں نفاست و صداقت کے ساتھ کارفرما دکھائی دیتے ہیں----- بہر حال ابھی طبلے کی گونج تھمنے نہ پاتی تھی کہ اہلِ محفل میں سے کوئی صاحب گھن گرج کے تحت اللّفظ

میں عدؔم کا یہ شعر پڑھ کر ''فرخندہ شمی'' کا گجر بجا دیتے کہ:

لرزتے آنچلوں کے گفتگو کرنے کی رُت جا گی
دھڑکتی چھاتیوں کے شعر خواں ہونے کا وقت آیا

اور قافلۂ احباب سارنگیوں کو طے کر کے شہر کے بازاروں میں گُھومتا ہوا دریا کے کنارے جا نکلتا جہاں دریا کے اندر چیل، دیودار کی موٹی موٹی ''گیلیوں'' کے بندھے اور تیرتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر نئے سرے سے محفلِ شعر وسُخن جم جاتی، جس میں دل کی واردات اردو اور فارسی سے گزر کر پنجابی ابیات، ٹپّوں اور بولیوں میں ادا ہونے لگ جاتی گویا:

جسے جو کچھ بھی آتا جا رہا ہے یاد ، کہنے دو
بقدرِ ظرف سب کو عشق کی رُوداد کہنے دو

عدم کو باقاعدہ فکرِ سُخن کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اِس کیفیت میں بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ فکرِ سُخن میں مصروف نہ ہوں۔ شعر کہنے کے لیے اُن کو کسی خاص ماحول یا فضا کی ضرورت نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا شعر اُن کے اندر انگوروں، آموں، ناشپاتیوں کی طرح پکتے رہتے تھے اور وہ توڑ توڑ کر مضامینِ تازہ کے انبار باہر لگاتے چلے جاتے۔ وہ اُن شعراء میں نہیں، جو مناظرِ قدرت پر کہنے کے لیے پہروں اور دِنوں جھیل وُلّر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے رہیں یا۔۔۔۔۔سامنے تاج محل ہو تو غزل ہوتی ہے!

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عدؔم ''بی ایچ کیو'' کے بے تاج بادشاہ تھے۔ احباب جس ذوق و شوق سے اُن کی ناز برداری کرتے، اُس کو دیکھ کر گمان ہوتا کہ ان لوگوں کو ہوسٹل کا باورچی خانہ چلانے یا عدؔم کا کلام سُننے اور گانے کے سوا دُنیا کے کسی کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ اُن کے خلوص و محبت کی ادا دیکھ کر انسان کا شرفِ سعادت پر ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ''مکتبۂ التحریر'' کے نوجوان مالک جناب سیف اللہ ۱۹۴۰ء میں کس عالم میں تھے لیکن جس ذوق و شوق، لگن، چاؤ اور لگاؤ سے چمکا لِشکا کر اُنھوں نے ''آبِ زر'' شائع کی ہے اس کو دیکھ کر خیال کرتا ہوں کہ اگر خالدؔ صاحب اُس

وقت جہلم میں ملازم ہوتے تو یقیناً ''بی ایچ کیو'' کے گروہِ ''ذومستاں'' میں شامل ہوتے۔

اپنی ذات اور گردوپیش سے عدؔم کا سلوک گونا بےخودی کا سلوک تھا۔ تہی کیسہ وخورسند گرفتار مگر آزاد۔ سفینۂ غزل اور صراحیِ مئےَ ناب کے علاوہ کسی شغل وشوق کو عدؔم نے کم ہی شرفِ باریابی عطا کیا ہوگا۔ البتہ سگرٹوں میں نصف سے زیادہ تنخواہ پھونک دیتے تھے۔ خوش خوری کی خواہش ضرور تھی، لیکن اگر کوئی دوسرا پکا پروس کر سامنے رکھ دے۔ سُنا ہے ایک زمانے میں ''پنڈی سپورٹس کلب'' میں کرکٹ کے اسٹار کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ اُن کا یہ شعر اسی شوق کی عکاسی کرتا ہے: ؎

ہمارا بَیٹ گزارہ تو کر ہی لیتا ہے
بقاؔ ، حبیبؔ ، امر ناتھ یا نثار آئے

''بی ایچ کیو'' میں اُن کا یہ شوق گو ابھی مرنے تو نہیں پایا تھا مگر زندہ بھی نہیں تھا۔ رغبت کی چنگاری جاگتی تو اُن کا جی چاہتا کہ پہلے تو کوئی شخص آ کر اُن کو کرکٹ کی کِٹ (KIT) میں داخل کر جائے پھر کرکٹ کی تعریف میں ایک آدھ غزل ترنّم کے ساتھ سنائے اور پھر آگے میدانِ عمل میں بھی ''رننگ کومنٹری'' (RUNNING COMENTARY) کے ذریعے ہوشیار، خبردار کرتا رہے کہ:

حضور! اِدھر دیکھیے ، حضور! اُدھر دیکھیے
حضور! آہستہ آہستہ ، جناب! آہستہ آہستہ

البتہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں شاعری کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی لَو لگی رہتی تھی۔ ہم نے پورے عدؔم کو کسی بیرونی کام کی طرف صدقِ دل سے کاملاً متوجہ نہیں دیکھا۔ آدھا عدم آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آدھا کسی غزل کے لیے نئی زمین تلاش کی تلاش میں خدا معلوم کہاں غائب ہے۔ شیو بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے چہرے پر صابن بچھ رہا ہے لیکن دوسرے ہاتھ سے اپنے اندر کسی تازہ شعر پر اُسترا پھیر رہے ہیں: ؎

ہماری بہتری کی بات اکثر ہمارے فہم سے باہر رہی ہے

بعض باتوں میں اُن کی مستعدی پر حیرت ہوتی تھی۔ اُن میں ایک دفتر کی حاضری تھی۔ دفتر کے وقت گھر سے یوں نکل جاتے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ پھر رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت کا شعبہ تھا جو ''ایڈیٹر نگار'' علامہ نیاز فتح پوری سے لے کر مُنشی خادم حسین حیدری ایڈیٹر ''نئی زندگی'' تک سینکڑوں ایڈیٹروں تک پھیلا ہوا تھا۔ خطوط کے جواب لکھنے میں اگر آپ ہمہ تن مستعد نہ ہوتے تو اپنی ڈاک میں دب کر رہ جاتے۔ ''بی ایچ کیو'' کے ''امیر البحر'' جو مقامی واٹر ورکس میں چھوٹے انجینئر تھے، عدم کی خط و کتابت کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اتنی ڈاک اگر کسی یونانی دواخانے کو نصیب ہو جائے تو طبِّ یونان کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔ دوستوں سے اخلاص و مروّت کے باب میں اُن سے تساہل تو ہوسکتا ہے، لیکن تغافل کو عمدًا اوہ روا نہیں رکھتے۔ وہ چیز جس کو اُن کی زندگی میں رَوِشِ خاص کہنا چاہیے، دوستی اور دوست داری کے جذبوں سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اگر اِس وقت آپ ساٹھ برس کے ہو چکے ہیں تو میرا قیاس ہے کہ ان میں سے کم از کم پچاس برس دوستوں کے جھرمٹوں میں گزرے ہیں۔ برس بھی ایسے کہ:

ہر برس کے ہوں دن ہزار برس

کچھ عرصے بعد بھابھی راولپنڈی سے گھوڑے اور شیر وغیرہ کو لے کر جہلم پہنچ گئیں تو عدؔم صاحب علیحدہ مکان میں اُٹھ گئے۔ خیال ہوا کہ اب شاید اُن کی روانی میں کچھ لُکنت پیدا ہو جائے لیکن اُن کے شاعرانہ انہماک اور گم شدگی کی بالکل وہی صورت رہی جو پہلے تھی۔ اُن کا ایک شعر ہے:

ہم کو رغبت ہی نہیں خلق فریبی سے عدم
ورنہ ہم صاحبِ اسرار بھی ہو سکتے ہیں

''خلق فریبی'' کے علاوہ بھی سینکڑوں باتیں ہیں جس سے آپ کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ اِن میں ایک چیز گھر داری ہے۔ اہل و عیال سے اُن کی محبت کی شدّت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ حجام سے اپنے سامنے گھوڑے کی ''نعل بندی'' یعنی اُس کے ناخن نہیں ترشوا سکتے تھے لیکن گھر کا ---- کارخانہ چلانے کے واسطے نون تیل لکڑی کے کھڑاگ سے اُن کو سخت وحشت تھی۔ وہ اپنے گھر کو مسرور،

پُراطمینان اور فراغت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔مگر بس ایسے ہی جیسے اُن کے شعر آپ ہی آپ پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔غالبؔ کو دشت دیکھ کر گھر اور عدمؔ کو گھر دیکھ کر دشت یاد آتا تھا۔

بعض راتوں کو عدم ہوتا ہے محسوس مجھے
اِتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

بہرکیف امُورِ خانہ داری میں خوش دلی سے اُن کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ عدمؔ صاحب کسی دوسرے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔تعاون کے بھرپور مُوڈ (MOOD) میں بھی زیادہ سے زیادہ یہ کیفیت ہوتی تھی کہ:۔

نہ اُلجھا رہے ہیں ، نہ سُلجھا رہے ہیں

اِن معاملات میں عدمؔ کی عدم دلچسپی یا فراموش گاری کا ایک واقعہ بھی سُن لیجیے:

بازار میں ''فرخندہ شبی'' کی ابتدائی چہل قدمی ہورہی تھی کہ یک بارگی آپ نے نعرہ لگایا:

''حضور! کبابوں کی دعوت آج اِس فقیر کی طرف سے قبول ہو۔''

لیکن کباب کھانے اور گشتِ شبینہ بھگتانے کے بعد رات کے دوڈھائی بجے ہم لوگ جب اُن کو گھر کی ڈیوڑھی پر خدا حافظ کہنے لگے تو آپ کو ناگاہ یاد آیا کہ گھر سے چلتے وقت بیوی نے یہ کہہ کر کہ ''گھر میں آٹا نہیں ہے''، پانچ روپے اُن کی جیب میں ڈال دیے تھے۔اُوپر کی منزل میں اُس وقت قمقمہ روشن تھا،لیکن-------- پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

اُن کی مُستعدی کے کھاتے سے یاد آیا کہ عدمؔ بظاہر جتنے کھوئے کھوئے ،سوئے سوئے رہتے ،ذہن میں اُتنے ہی چوکس ہوتے۔لوگ گفتگو کررہے ہوں تو وہ عموماً ''ٹیوب'' چلے جاتے اور پھر ایسا لگتا تھا کہ اُن کو طبلے کی تھاپ سے جگانا پڑے گا۔مگر جہاں کہیں موقع آتا،دفعتاً ''ٹیوب'' سے نکل کر ایسی چمکتی ہوئی بات کہہ جاتے کہ محفل چمک اُٹھتی ۔اگر کوئی جملہ نہیں سُوجھا تو ہر موضوع ، ہر کیفیت ، وقت اور موسم کے حسبِ حال کوئی نہ کوئی اپنا شعر یقیناً موجود ہوتا کہ اپنا کلام جس قدر عدمؔ کو یاد تھا،کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی یاد ہو۔اُن کے بعض حلقہ بگوش نیازمندوں اور اِرادت کیش مداحوں کا تو یہ خیال

ہے کہ عدمؔ صاحب کو اپنا سارا کلام زبانی یاد ہے۔ وہ بھی جو طبع ہو چکا ہے۔ وہ بھی جو ابھی طبع نہیں ہوا بلکہ وہ بھی جو ابھی کہنا ہے۔ سچ تو کہا ہے اُنھوں نے کہ: ؎

عدمؔ تم صرف اپنی ذات کو وِرثہ گِنو اپنا
حریفوں کو حدیثِ شوکتِ اجداد کہنے دو

ذہنی مُستعدی کے علاوہ عدمؔ کی ذہنی دیانت داری اور جرأت پر بھی حیرت ہوتی تھی۔ صرف گفتگو ہی نہیں، سماجی زندگی کے ہر دائرے میں اس کا ساریشم کی طرح نرم و ملائم شخص خال خال ہی نظر آتا ہے۔ جس طرح میرے پیر و مرُشد مولانا چراغ حسن حسرتؔ اپنی نرم گُفتاری کے بہاؤ میں اپنے بیٹے کو بھی ''مولانا'' کہہ جایا کرتے تھے۔ اِسی طرح عدمؔ صاحب گلی محلے میں کھیلنے والے بچوں کو بھی ''حضور'' اور ''جناب'' کہہ کر بلاتے تھے۔ محبت و مروّت، امن و آشتی اور خُلق و اِنکسار کا دوسرا نام عدمؔ ہے۔ وہ دوہرے جُثّے کے تنومند شخص ہیں لیکن اِس تن و توش میں فروتنی ہی فروتنی بھری ہوئی ہے۔ بعض اوقات تو شُبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتے۔ لیکن جناب کیا مجال جو کوئی ایسی بات جو اُن کے نظریۂ حیات سے متصادم ہو یا اُن کی رائے میں انسان اور کائنات کی عظمت اور آسودگی کے منافی ہو، اُن کے شعر کی زد سے بچ کر نکل جائے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنے گفتنی مضامین آج تک ''خوفِ فسادِ خلق'' کے سبب سے ناگفتہ رہ گئے تھے، عدم صاحب اُن تمام کو ریکارڈ پر لا کر چھوڑیں گے۔

بعض لوگ چیں بچیں ہو کر کہتے ہیں کہ عدمؔ صاحب بعض اوقات ''گفتنی اور ناگفتنی'' کی حدود میں امتیاز روا نہیں رکھتے جو چنداں مستحسن بات نہیں ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اُن کی جارحانہ یلغار کا مقصود ہی یہ ہے کہ حدود اُن کا راستہ نہ روک سکیں۔ وہ تو بہرحال وہی بات کہیں گے جو وہ کہنا چاہتے ہیں: ؎

قتل گاہوں سے خوف کھا کے عدمؔ
عشق کب راستہ بدلتا ہے

''بی ایچ کیوُ'' سے نکلنے کے کئی برس بعد عدمؔ صاحب سے راولپنڈی میں جی ایچ کیو

(GHQ) کے قریب ملاقات ہوئی۔ اب وہ اپنے حساب کتاب کے محکمے میں افسری کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ جنگ کے دوران میں بغداد اور بصرہ کے قیام سے ذہن بھی اور چہرہ بھی دو آتشہ ہو رہا تھا۔ تنخواہ ہر چند کافی معقول تھی، لیکن ہوش مندی کی طرف کچھ زیادہ ہی رغبت بڑھ چکی تھی۔ کبھی کبھار تو خود اُن کے بقول: ؎

چاندنی راتوں میں ہم پیتے رہیں گے شب بھر
دَورِ مہتاب ہے ، تھمتے ہی تھمے گا ساقی!

شیشہ و پیمانہ سے عدمؔ کی ہمدمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ جناب مختار مسعود کے بقول عدم ''خرابی اور خرابات کے شاعر ہیں۔'' شراب ان کو گھٹی سے نہیں بلکہ مُٹھی سے ملی ہے یعنی جب پیسہ اُن کے ہاتھ آیا۔ اُن کا ہاتھ سیدھا گردنِ مینا پر جا پڑا۔ اور عارضی مسرّت کو اپنی کمائی کا بہترین معاوضہ خیال کیا۔ درمیان میں کئی مرتبہ ''خشکی'' کے وقفے بھی آتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا:

''سُنا ہے آپ نے شراب ترک کردی ہے؟'' فرمایا:

''میں نے شراب نہیں چھوڑی، شراب مجھے چھوڑ گئی ہے۔'' لیکن اب وہ ''دَورِ مہتاب'' تھمے یا جاری رہے، روحانی طور پر اُن کے روزانہ کردار کے استحکام کا یہ عالم ہے کہ ان کی مستانہ وشی اور جانانہ روی کی وہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ظاہر ہے کہ گھر کے مسائل و معاملات اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکے تھے مگر عدمؔ سے اُن کا ''ذوقِ شکر خند'' کون چھین سکتا ہے؟ چنانچہ ہر وقت نیاز مندوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ معمولات کی ترتیب بلکہ افراتفری میں سرِ مُو فرق نہیں آیا تھا۔ ملاقات کا وقت باقیؔ صدیقی سے طے ہے اور چلے جا رہے ہیں پروفیسر شوکت واسطی کے ساتھ مشاعرے میں۔ اُن کا سیکرٹری موٹر لیے کھڑا ہے مگر آپ نکل گئے ہیں، میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کے ساتھ۔ کہاں گئے ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ کب واپس آئیں گے؟ کِسی کو کچھ معلوم نہیں! عدمؔ اِن معاملات میں ''مقدم، مقدم'' کے اصول پر کار بند ہیں۔

دوستوں کے لیے ہر وقت محبت کی رہ گزر پر چشم براہ بیٹھے رہتے ہیں۔ جو پہلے آ گیا، اپنے ساتھ لگا کر لے گیا، جو بندھ گیا سو موتی۔ اُستاد داغ کے اِس مشہور مصرعے کو کہ: ؎

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، سو بیٹھ گئے

آپ عموماً اِس طرح پڑھا کرتے ہیں:

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے، لیٹ گئے

عدم صاحب جب تک کلرک رہے، اُن کے سپرنٹنڈنٹ، یونٹ اکاؤنٹنٹ اور افسرانِ بالا اُن سے عمومًا خوش رہتے تھے کہ وہ بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ مگر بعض افسرانِ اعلیٰ اس بات پر خفا بھی رہتے تھے کہ عدمؔ اِتنی اچھی انگریزی کیوں لکھتے ہیں؟ ملازمت میں عدمؔ صاحب کے اپنے طرزِ عمل کی اوسط نکال کر دیکھی جائے تو وہ اپنے افسروں کو عمومًا آزُردہ اور ماتحتوں کو نہال رکھتے تھے۔ راولپنڈی میں کلرکی کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ اپنے بڑے دفتر کی چوبی سیڑھیاں چڑھتے اُوپر جا رہے تھے کہ اُن کا ہندو سپرنٹنڈنٹ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ سیڑھیوں کے وسط میں آمنا سامنا ہو گیا تو لالہ جی نے پوچھا:

''مسٹر! آپ ایک بجے سے ساڑھے تین بجے تک کہاں براجمان تھے؟'' عدم نے فورًا جواب دیا:

''میں جمعہ پڑھنے گیا تھا۔''

اوپر سے دو اور مسلمان کلرک اُتر رہے تھے۔ لالہ جی نے اُن سے پوچھا:

''تم جمعہ پڑھنے کیوں نہیں گئے؟'' اُنھوں نے جواب دیا:

''آج تو منگل ہے۔''

اِس پر عدم نے برجستہ کہا:

''منگل ہو یا جمعہ، میں تو جمعہ پڑھ آیا ہوں۔'' ظاہر ہے کہ پڑھا ہوا جمعہ مشکل ہی سے واپس لایا جا سکتا تھا۔

اب افسری کے زمانے میں اُن کی بے نیازی اور فراموش گاری کا بھی ایک واقعہ سُن لیجیے۔ ملٹری اکاونٹنٹ جنرل الحاج شجاعت علی صدیقی مشاعروں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ایک محکمانہ مشاعرے میں راولپنڈی کے سرکردہ شعراء کو مشاعرہ گاہ یعنی کمانڈ کنٹرولر کے دفتر کے بڑے ہال میں لانے کی ڈیوٹی عدؔم صاحب کے سپرد کی گئی تھی، اور آپ نے واقعی شہر کے نامی گرامی شعراء کو لا کر سٹیج پر بٹھا دیا۔لیکن موٹر کے آخری پھیرے میں جانے کیا پیچ پڑا کہ مشاعرہ مقطع تک پہنچ گیا، مگر عدؔم کا کوئی سراغ نہ تھا۔ بلکہ اُن کے ساتھ دو ایک دوسرے نامور شاعر بھی لاپتا تھے۔اگلے روز دفتر میں پیشی ہوئی تو آپ نے اپنے مخصوص بھولپن کے ساتھ الحاج کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''حضور! خدا کی قسم میں آ رہا تھا بلکہ شاد امرتسری کو بھی ساتھ لا رہا تھا۔اُس کمبخت نے مجھے راستے میں ایک جگہ بٹھا لیا اور پھر جب ہم وہاں سے چلے تو بخدا پہلے تو ہال نہ ملا اور جب ہال ملا تو مشاعرہ نہ ملا۔''

میں نے اُن کو افسری کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ڈسپلن کے بغیر کام کے معیار اور رفتار کو برقرار رکھنے کا سلیقہ اُن پر ختم تھا۔دفتر کے کلرک تلازمہ غزل کی طرح ہنسی خوشی صبح سے شام تک کام میں جُتے رہتے تھے۔شروع شروع میں تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ آپ فائلوں پر ڈرافٹ لکھنے کی بجائے کوئی غزل لکھ کر افسر کی میز پر رکھ آتے ہوں گے۔مگر قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عدؔم نے اپنی ذات سے یکسر مُنہ موڑ کر اگر کسی چیز سے مفاہمت کی تھی تو وہ ملازمت تھی۔یوں دفتر میں بھی ان کا عام اسلوب یہی رہا کہ: ؎

حشر میں لے کے چلو مُطرب و معشوق و سبُو
غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

عدؔم صاحب گھر میں ہوں، احباب میں ہوں، کسی ''تجلّی خانے'' میں یا دفتر کے ظلمت کدے میں، وہ ابھی تک ''بی ایچ کیو'' سے نہیں نکلے۔اور یہ وہ منزل ہے:

جہاں تک مسافر بہت کم گئے ہیں!!

☆☆☆☆☆

کشور ناہید

عبدالحمید عدؔم .... مَیکدے کی راہ پر چلنے والا

یہ بات ہے دسمبر 1961ء کی۔ شدید سردی کی رات میں 4 بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ یوسف نے دروازہ کھولا۔ عدؔم صاحب سامنے تھے، جھٹ بولے: ''ارے سُنا ہے، بیٹا ہوا ہے۔ لاؤ مجھے دِکھاؤ۔ اچھا پہلے ٹیکسی والے کو پیسے دے آؤ۔'' یوسف نے اُنھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا، کہا: ''عدؔم صاحب بیٹے کو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے ضد کی: ''مت چھیڑو، جاگ جائے گا۔'' یوسف نے کمبل میں لپیٹ کر اُسے اُٹھایا۔ عدم صاحب نے چوما اور کہا: ''میرے ولوں اینوں دس روپے دے۔'' یوسف نے ہنس کر دے دیے، واپس لا کر لٹا دیا۔

صرف عدؔم صاحب ہی نہیں، سارے سینئر شاعر مجھے اپنے گھر کا حصہ سمجھتے تھے اور اسی طرح یوسف کو بھی پیار کرتے تھے۔ عدؔم صاحب کا دفتر، لاہور ہوٹل کے قریب تھا۔ پہلی تاریخ کو جب تنخواہ ملتی تو اِرد گرد، مخمور دوستوں کا گروہ سامنے ہوتا تھا۔ وہ تنخواہ اُن میں تقسیم کر کے، دفتر سے قرض لے کر گھر جایا کرتے تھے۔ بہت سال ایسے گزرے، آخر ایک دن اُن کی بیگم نے عدؔم صاحب کے افسرِ اعلیٰ کو پوری داستان سُنائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب عدؔم صاحب کی آدھی تنخواہ تو گھر بھیج دی جاتی اور آدھی تنخواہ عدؔم صاحب کے حوالے کر دی جاتی۔ ڈپٹی آڈیٹر جنرل ہونا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی، مگر اُنھوں نے کبھی کسی کو بھی افسری نہیں دکھائی۔ ایک دفعہ دوپہر کے وقت وہ دفتر سے نیچے اُتر رہے تھے، سامنے سے افسرِ اعلیٰ آئے۔ پوچھا: ''کہاں جا رہے ہیں؟'' بے ساختہ بولے: ''جمعہ کی نماز پڑھنے۔'' افسر نے کہا: ''ہاں ہاں جایئے۔'' اُس دن منگل تھا۔ عدم صاحب ایسی معصومانہ باتیں اکثر کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے

کے باس بھی اچھے ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ناصر کاظمی کے بارے میں دفتر کا عملہ شکایت کرتا تھا کہ یہ شخص کرتا کیا ہے؟ تو اِدارے کے سربراہ صادق قریشی کہتے تھے: ''تم نہیں سمجھتے، یہ دفتر نہیں رہے گا، میں نہیں رہوں گا، مگر لوگ یہ بات یاد رکھیں گے کہ یہاں ناصر کاظمی کام کرتا تھا۔'' یہی بات عدمؔ صاحب کے باس بھی کہا کرتے تھے۔

عدم صاحب مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھے۔ مشاعرہ آٹھ نو بجے شروع ہوتا تھا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مشاعرہ گاہ میں عدمؔ صاحب ایسے داخل ہوتے تھے جیسا کہ آپ نے چاند پر پہنچنے والے کے قدم دیکھے ہوں گے۔ سُننے والے عدمؔ صاحب کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔ ظرف والے لوگ تھے، کبھی کسی نے نہیں کہا، جیسا کہ اب ہوتا ہے کہ دیکھو وہ شرابی آ رہا ہے۔ عدمؔ صاحب جتنی دیر چاہتے، شعر سُناتے جاتے، لوگ محبت سے سُنتے جاتے۔

عدمؔ صاحب ریٹائر ہوئے تو کبھی رائل پارک کے کسی اڈّے پر، کبھی احمد راہیؔ کے حجرے پر اور کبھی ''سکرین لائٹ'' کے کمرے میں شام گزارتے۔ اکثر شاد امرتسری اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ ایک روز شام زور زور سے آواز آئی ''ٹیکسی خالی ہے۔'' ہم دونوں نے پہچان لیا، یہ تو عدمؔ صاحب کی آواز ہے۔ باہر نکلے۔ وہ کسی دیوار کو پکڑ کر جھول رہے تھے۔ یوسف نے فوراً ٹیکسی لی۔ بیٹھتے ہی کہنے لگے: ''چلو گھر، آج قیمے والے پراٹھے بنے ہوں گے۔'' ہم عدمؔ صاحب کے گھر پہنچے۔ چونکہ رات کے دس بج چکے تھے، اِس لیے کئی دفعہ ہارن دینے کے بعد دروازہ کھلا۔ عدمؔ صاحب ہم سے کہے جا رہے تھے ''تم جاؤ۔'' ہم نے کہا ''ٹیکسی میں ہمیں واپس جانا ہے، آپ اُتریں تو سہی۔'' اِتنے میں گھر والے آ گئے۔ ان کو گھسیٹتے ہوئے اور کہتے ہوئے ''لے آتے ہیں ڈرنک کروا کے۔'' ہم ویسے ہی شرمسار ہو رہے تھے۔ خیر ٹیکسی موڑی۔ ابھی اُن کے گھر سے باہر بھی نہ نکلے تھے، عدمؔ صاحب نے دروازے میں سے کہا: ''یوسف، کشور! آؤ، قیمے والے پراٹھے۔'' ہم ہنستے ہوئے چلے گئے۔

عدمؔ صاحب کی زندگی میں تمام پبلشر بغیر اجازت لیے اُن کی کتابیں شائع کرتے رہتے تھے۔ اب بھی یہی حال ہے۔ اُن کو چاہنے والے بھی اتنے نہیں ہیں۔ یہ کیا سبب ہے کہ چاہے اختر

شیرانی ہو کہ ساغر صدیقی یا عدؔم صاحب، اُن کے جانے کے بعد، چند گانے والیاں ایک آدھ غزل تو گا لیتی ہیں۔ کوئی ملکہ پکھراج کی طرح یہ غزل نہیں گاتا ''ارے مَے گساروں سویرے سویرے۔''

عدؔم صاحب کو ریٹائر ہوئے کافی مُدت ہوگئی تھی۔ ہم نے سوچا، چلو آج عدؔم صاحب کو دیکھ آئیں۔ اُن کے گھر پہنچے تو ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ بڑھی ہوئی داڑھی، ہاتھوں کے ناخن بڑھے ہوئے ناخن، مجھے فوراً جوؔش صاحب کے آخری دن یاد آ گئے۔ اُن کا تو اِس سے بھی بُرا حال تھا۔ یوسف بازار سے نیل کٹر لینے گئے۔ میں نے اُن کے ناخن کاٹے۔ خاندان والوں میں سے کوئی بھی تو ہم سے ملنے نہیں آیا۔ میں نے ایسا منظر مرتے وقت، شاد امرتسری کا بھی دیکھا تھا۔ اب لکھتے وقت مجھے شکیب جلالی اور غلام محمد قاصر کے بچے یاد آ رہے ہیں، جنھوں نے اچھی نوکریوں پر پہنچ کر اپنے اپنے باپ کو یاد رکھا اور کلیات شائع کیں۔

عدؔم صاحب پر لکھتے ہوئے اُن کا یہ شعر بہت یاد آ رہا ہے:

میں مَے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا

فارغ بخاری

پیرِ مغاں

یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک عرصہ تک پورے برِ صغیر کے شاعر جھوم جھوم کر عدؔم کی غزلیں پڑھتے اور اُن کے نشہ سے سرشار ہو کر لہراتے رہے ہیں۔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے نستعلیق قسم کے بزرگوں کو ہم نے اس کے بادہ و جام سے بھیگے شعروں سے بہکتے اور لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شراب اکثر و بیشتر شاعروں کی کمزوری رہی ہے۔ عدؔم بھی شراب کا رسیا تھا۔ اُس کے اندر اِس کی اِتنی طلب تھی جیسے جنم جنم کا پیاسا ہو۔ بوتل دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں یوں چمک اُٹھتیں جیسے کوئی خزانہ پا لیا ہو۔ وہ پورے خلوص اور سپردگی سے پیتا اور مدہوشی کی آخری حد تک پیتا۔ لیکن اُس کا کمال یہ ہے کہ اُس کی غزل خصوصاً قطعات میں شراب کی کیفیات اور نشے کی طلسمی واردات کچھ ایسی رنگا رنگی سے آئی ہیں کہ غالبؔ، جوشؔ اور فراقؔ کے بعد شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں اِس موضوع پر ایسا بھرپور تصور ملتا ہو۔

شراب ایسی کافر چیز ہے جو انسان کو ننگا کر دیتی ہے۔ جھوٹی شرافت، تہذیب، نیکی سے کیمو فلاج کی ہوئی شخصیت کے سارے سرخاب نوچ کر اُسے اصلی رُوپ میں سامنے لے آتی ہے۔ ہم نے اِس عالم میں بیسیوں دوستوں کی ہیئت کذائی دیکھی، جسے دیکھ کر خوف آنے لگا اور اُن کے متعلق ساری خوش فہمیوں کے محل زمین بوس نظر آئے۔ عدؔم نشے میں دُھت ہو کر ہونق ضرور لگتا ہے لیکن وہ معصومیت، انکساری اور پیار کا مجسمہ بن جاتا ہے اور شرفِ انسانی کے سارے رنگ دھنک کی طرح نکھر کر اُس کی شخصیت میں اپنا جادو جگانے لگتے ہیں۔

عدم کی زندگی شراب اور شاعری سے عبارت تھی، وہ حسن کا دلدادہ ضرور تھا لیکن شاعری کی حد تک۔ عورت عموماً شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بڑے بڑے پاک باز شاعر عورت کو دیکھ کر ریشہ خطمی ہونے لگتے ہیں، پھر شراب اور عورت تو لازم و ملزوم ہیں۔ شراب

پی کر تو عورت کے قُرب کی خواہش نے ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ نہایت ثقہ شاعر بونے نظر آنے لگے۔ اِس کے برعکس عدؔم کا یہ خانہ بالکل خالی تھا۔ شاعری میں تو وہ اِس معاملے میں خوب کھیلا ہے لیکن عملی زندگی میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ حالانکہ مشاعروں میں مہ وشوں کا ہجوم اُسے گھیرے رہتا لیکن اُس کی کسی حرکت سے کبھی رغبت کا اظہار نہیں پایا گیا۔ وہ نہ پارسائی کا دعویدار تھا نہ اِتنا گہرا آدمی تھا کہ اِس روگ کو دل ہی دل میں پالتا رہا ہو۔ اُس کی زندگی تو کھلی کتاب تھی جسے ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔ اگر معاشقوں کا کوئی چکر ہوتا تو وہ ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اظہار کرتا لیکن اُس کا کوئی ہم مشرب دوست بھی اس کی گواہی نہیں دیتا کہ اِس کوئے ملامت میں اُ کا کبھی گزر ہوا ہو بلکہ ایک روایت کے مطابق تو ایک حسین و جمیل شاعرہ نے اُسے اپنانے کے لیے بڑے جتن کیے۔ اُس کی شاگردی اختیار کی، مشاعروں میں اس کے لیے بھٹکتی رہی لیکن اُس نے پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیا۔ اور یہ عدؔم کی زندگی کے اس پُر آشوب دَور کا واقعہ ہے جس کے متعلق کسی نے کہا ہے:

چڑیل پر بھی گماں حور کا ہُوا ہے ہمیں

وہ اپنی عام زندگی میں بڑا بونگا شخص لگتا تھا، شاعر سے زیادہ اس پر کسی کارخانے کے مزدور کا گمان ہوتا، نہ اچھا پہننے کی فکر، نہ اچھا کھانے کا شوق، نہ صحت وصفائی کا خیال، کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتا، غسل کرنا تو کجا ہاتھ مُنہ دھونے سے بھی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دانت تو اُس نے شاید زندگی بھر کبھی صاف نہیں کیے۔ بالوں میں کنگھی کرنے کو بھی وہ وقت کا ضیاع سمجھتا، ہفتوں دوستوں کے ہاں مدہوش پڑا رہتا۔ البتہ دفتر جانے کی پابندی شروع شروع میں کرتا رہا۔ لیکن آخر اس سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ عدؔم ایک ذہین و فطین انسان تھا۔ اُس نے ملٹری اکاؤنٹس میں ایک کلرک کے طور پر زندگی کا آغاز کیا اور اس کے اعلیٰ عہدے تک رسائی حاصل کر لی۔ اپنے کام میں اُس کی ذہانت نے اُسے ایسا ماہر کر دیا تھا کہ تھوڑی دیر میں ساری فائیلیں بھگتا دیتا۔ آخری ایام میں وہ کئی کئی دن دفتر سے غیر حاضر رہتا۔ لیکن دفتر جاتے ہی چند گھنٹوں میں پچھلا سارا کام نپٹا کر نچنت ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اعلیٰ افسر بھی اُس کی غیر حاضری کا نوٹس نہ لیتے اور کچھ یہ بات بھی ایسی تھی کہ اُس کی شہرت و ناموری سے بھی دفتر والے مرعوب

تھے اور اُس کے احترام میں اُس کی لغزشوں کو صرفِ نظر کر دیتے تھے۔ اُس نے ساری ملازمت میں کبھی درخواست دے کر چھٹی نہیں لی۔ ایک دو روز کی غیر حاضری کو تو دفتر والے یونہی ہضم کر جاتے، معاملہ تجاوز کر جاتا تو درخواست خود ہی ٹائپ کر کے "داشتۂ آبکار" کے طور پر فائل میں رکھ لیتے۔

گھر سے ہفتوں غائب ہونا تو اُس کا معمول تھا۔ کبھی کبھی مہینوں گھر کی صورت نہ دیکھتا۔ بچّے اُس کے ٹھکانوں پر تلاش کرتے کرتے سراغ پاتے تو اُسے گھر لے جاتے۔ جہاں اُسے نہلایا جاتا، حجامت بنوائی جاتی، میل اور بدبو سے اٹے کپڑے بدلوائے جاتے اور اِس طرح کئی دنوں کے بعد اُسے کہیں جا کر انسانوں کا روپ نصیب ہوتا۔

ایک دفعہ سرگودھا میں مشاعرہ تھا۔ منتظمین نے کسی حویلی میں شاعروں کو ٹھہرایا تھا۔ مشاعرہ ختم ہونے لگا اور عدمؔ اور الطاف مشہدی عدمؔ پتہ تھے۔ اُن کی تلاش میں سرگودھا کا کونہ کونہ چھان مارا، آخر دو بجے ایک سستے سے ہوٹل میں وہ نشے میں دُھت دستیاب ہوئے۔ مشاعرے کے پنڈال میں دو دو آدمی سہارا دے کر اُنھیں اسٹیج پر لائے۔ الطاف مشہدی کو پڑھنے کے لیے مائیک کے سامنے کھڑا کیا گیا، لیکن لڑکھڑا کر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ عدم رینگتے رینگتے خود ہی مائیک تک پہنچے، بیٹھے بیٹھے پڑھنا شروع کیا اور ایسا رواں ہوا کہ پورے ایک گھنٹے تک بیسیوں غزلیں اور قطعات سُنا ڈالے۔ مشاعرے کے بعد وہی پھر بوتل لے کر بیٹھ گئے اور نجانے کب تک پیتے رہے۔

مشاعروں میں شاعروں کے متعلق ایسے بے شمار لطیفے ہیں۔ فراق اور مجید لاہوری کو مَیں نے لائل پور کے ایک مشاعرے کے بعد اِس سے بدر جہا ابتر حالت میں دیکھا ہے۔ اور اختر شیرانی کا کچھ نہ پوچھیے، پشاور کے ایک ریڈیو مشاعرے میں مدعو تھے۔ مشاعرے کے بعد دوسرے دن صادق نیوز ایجنسی کے مالک لالہ وزیر محمد نے ہمیں بتایا کہ اختر شیرانی آئے ہیں اور ہمیں یاد کر رہے ہیں۔ ضیاء جعفری، نذیر مرزا برلاس، رضا ہمدانی اور میں بھاگم بھاگ لالہ کے گھر پہنچے۔ شاعرِ رومان سے ملنے کی خوشی میں اُڑتے ہوئے سیڑھیاں طے کیں۔ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو دیکھا اُردو شاعری کے رومانوی دور کا مجتہد شاعر فرش پر مدہوش پڑا چھلکوں سمیت سنگترے کھا رہا ہے۔ لالہ بولا: "آپ یاد کر رہے تھے،

فارغ بخاری آ گئے ہیں۔'' اختر نے مُنہ بنا کر ہچکی لیتے ہوئے کہا: ''فارغ بخاری! یہ کس جانور کا نام ہے۔'' لالہ نے ہنستے ہوئے کہا: ''یہ ضیا جعفری، برلاس اور رضا ہمدانی ہیں۔'' اختر بولا: ''یہ چڑیا گھر سے بھاگ آئے ہیں، کسی کو بلاؤ، انھیں لے جائے۔''

اگلی صبح میں اپنے مطب جا رہا تھا، قصہ خوانی میں صادق نیوز ایجنسی سے گزرا، لڑکے نے آواز دی، میں لوٹ کر آیا، اُس نے بتایا ''دوکان میں اختر شیرانی بیٹھے آپ کو بلا رہے ہیں۔'' میں اندر گیا۔ اُٹھ کر بڑے پیار سے ملے۔ رات کے واقعہ پر ندامت کا اظہار کیا، معافیاں مانگتے رہے، بولے: ''یہ سب اُم الخبائث کا کیا دھرا ہے، مجھ سے عبرت حاصل کرو اور اِس کے نزدیک مت بھٹکو۔'' میں نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ ہم نے ان کی باتوں کا بُرا نہیں منایا کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ آپ ہوش میں نہیں ہیں۔ اور میں دل ہی دل میں اس کی تعریف کرنے لگا، وہ واقعی عظیم شاعر ہے۔ مجھ سے ہیچمدان سے معافی مانگ رہا ہے، گلے لگا رہا ہے، چہرے پر بوسے دے رہا ہے، ہاتھ چوم رہا ہے۔ میں فخر سے پھول رہا تھا۔ اِتنے میں اختر نے دوکان کے سیل مین مامے سے بوتل مانگی۔ اُس نے معذرت کی کہ لالہ نے منع کر رکھا ہے۔ اختر نے بڑی منت سماجت کی کہ صرف سر دردی کے لیے ایک گھونٹ پیوں گا۔ اب جم خانے کا آدھا اختر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں اس میں سے نصف نیٹ چڑھا گیا۔ مجھ سے میرے ساتھیوں سے متعلق پوچھتا رہا اور پھر جو دورہ آیا تو دوسری سانس میں آدھا خالی کر کے سڑک کی طرف اچھال دیا، جہاں وہ ایک دھماکے سے کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ جس سے اس معروف بازار کی ٹریفک تھوڑی دیر کے لیے رُک گئی، جو لوگ ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے، جمع ہو کر اِدھر اُدھر جھانک رہے تھے کہ یہ کس کا کارنامہ ہے۔ ہم دوکان کے اندر ایسی جگہ بیٹھے تھے کہ ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کی غوغا آرائی کے بعد بات آئی گئی ہو گئی۔

اختر اپنی نظم لہک لہک کر سُنا رہے تھے کہ اچانک اُبکائی آئی اور پھر یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک اُن کے اندر کی ساری جمع پونجی باہر نہیں آ گئی۔ اب میں نے دیکھا تو اختر کے ساتھ میں بھی اُس نجاست میں نہا چکا تھا۔ مَیں نے لڑکے سے جھاڑن لے کر اختر کا مُنہ، ہاتھ پاؤں اور

کپڑے صاف کیے۔ وہ پھر معافی مانگنے لگا لیکن میں رسہ تڑا کر بھاگ نکلا۔ گھر آ کر غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور مطب جاتے ہوئے اختر کے متعلق سوچنے لگا لیکن میرے ضمیر نے اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔ اُس کی اِس اُفتادِ طبع کو بشری کمزوری پر محمول کیا اور بس!

اِسی طرح مجید لاہوری، فراق صاحب، الطاف مشہدی اور عدمؔ کے متعلق بھی میری رائے اُن کی لغزشوں سے کبھی متاثر نہیں ہوئی اِس لیے کہ میں خود حماقتوں کے اِس مقام پر فائز ہوں کہ اگر اس کے لیے کوئی اعزازی سند ہوتی تو کبھی کا حاصل کر چکا ہوتا۔ راولپنڈی کے ایک مشاعرے کا واقعہ ہے، شام کے وقت سب شاعر احمد ظفر کے باغیچے میں شغل کے بعد مشاعرہ پڑھنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ کچھ دوست جو زیادہ چڑھا گئے تھے زیادہ چہک کر اپنی ہوش مندی کا مظاہرہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک میں بھی تھا۔ قاسمی صاحب کو میں ان بلانوشوں کی حرکتوں کی طرف توجہ دلا کر یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر ہم نے بھی پی ہے لیکن کیا مجال جو کسی کو شبہ بھی ہو۔ اِسی دوران میں سگریٹ لانے کے لیے اُٹھا اور اگلے ہی لمحے باہر جانے کی بجائے مخالف سمت میں لگی ہوئی خاردار تاروں میں بُری طرح اُلجھ گیا۔ اور جب مجھے نکالا گیا تو کپڑے پھٹ گئے تھے اور بدن زخمی ہو چکا تھا۔ قاسمی صاحب نے مسکراتے ہوئے میرے کان میں کہا: ''تم تو اچھی خاصی ہوش مندی کی باتیں کر رہے تھے یہ کیا کر دیا؟'' اور میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا ''حماقت کسی کی میراث نہیں۔''

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردِگار دے

عدم پیدائشی شاعر تھا۔ شراب پینا اور اپنے شعر سُنانا، اُس کی زندگی کے یہ دو ہی محبوب مشغلے تھے۔ وہ شاعری کے نئے پرانے دبستانوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا کہ اپنے اِن مرغوب مشاغل سے مطالعہ کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس کا ایک فائدہ اُسے یہ ہوا کہ وہ مقصدی ادب، غیر مقصدی ادب، اسلامی ادب، رُجعتی ادب، ترقی پسند ادب اور مختلف ادوار کی تحریکوں اور جدید وقدیم ادبی رجحانات سے بے نیاز تھا۔ نہ کسی کو پڑھا ہے، نہ کسی سے متاثر تھا۔ اِس لیے وہ شاعر تھا اور جو کچھ کہتا وہ اس کی سوچ اور فکر کا عطیہ تھا، جس پر کسی اِزم، کسی کے رنگ کی کوئی چھاپ نہیں۔

اس نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غزل اور قطعات سے اُس کی طبیعت کو بڑی رغبت تھی۔ اس کے بہت سے شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں لیکن ''خرابات'' اُس کا ایسا جاندار مجموعہ ہے جس میں عدؔم کا رنگ خوب نکھرا ہے۔ یہی مجموعہ اس کی شہرت کا باعث بنا اور اسی سے اُس نے نام و مقام کمایا۔ اِس میں عدم صحیح معنوں میں بولتا محسوس ہوتا ہے اور اس کی شاعری اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اگر چہ اُس کی کئی کتابیں آئیں لیکن حادثہ یہ ہوا کہ اس عرصہ میں اُس کی ہَوَسِ مے نوشی بڑھتی گئی اور اسی رفتار سے احتیاج بھی بڑھتی گئی، اسی رفتار سے اس کا معیار گرتا گیا۔ پھر اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ صبح دفتر جانے سے پہلے کھڑے گھاٹ آٹھ دس غزلیں کمپیوٹر کی طرح لکھ ڈالتا۔ ظاہر ہے، اِس قافیہ پیمائی میں کوئی اچھا شعر مشکل سے ہی ہاتھ آتا۔ بلکہ بعد میں تو اپنے آپ کو دُہرانے کا عمل شروع ہو گیا۔ اِس میں شک نہیں کہ عدؔم کا نام بِکتا تھا۔ اِس لیے پبلشروں کے لیے اُسے چھاپنا گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اِس طرح ہر سال اُس کی دو تین کتابیں بھی آنے لگیں۔ رائلٹی کے بجائے صرف سو دو سو روپے میں کتاب کے جملہ حقوق بِکنے لگے اور اِس طرح اُس نے جیتے جی اپنے اندر کے فنکار کی تصویر کو دھندلا دیا۔

شراب بُری چیز سہی، لیکن اِتنی بُری نہیں، جتنا اِس کا ''ہوکھا'' بُرا ہے۔ شراب کے ''ہوکھے'' نے ہمارے کئی فن کاروں کو یا تو وقت سے پہلے نگل لیا یا اُن کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیا۔ اختر شیرانی، باری علیگ، منٹو، مجاز، مجید لاہوری، ابراہیم جلیس، شاد امرتسری اور عدؔم، سب کے سب اِسی دُخترِ رز کی عشوہ گری کے شہید تھے۔

عدؔم کے متعلق میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، جاننے والے جانتے ہیں کہ اِس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اُس سے میرے اور میرے ساتھی رضا ہمدانی کی سب سے پہلی ملاقات 1939ء میں راولپنڈی کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ 1938ء میں ہم نے پشاور سے ہفت روزہ ''شباب'' کا اِجراء کیا جسے ایک سال تک ہم جوں توں چلاتے رہے، یہاں تک کہ بال بال قرضے میں جکڑا گیا اور اپنی جنم بھومی پشاور سے ہجرت کرنے کے سوا ہمارے لیے اور کوئی چارہٗ کار نہ رہا، لیکن

ہجرت کے لیے زادِ راہ تک نہیں تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ بمبئی جا کر فلمی دُنیا میں قسمت آزمائی کی جائے جو اُس وقت شاعروں ادیبوں کی واحد پناہ گاہ تھی، لیکن کیسہ خالی ہونے کے باعث قسطوں میں وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہم نے پہلا پڑاؤ راولپنڈی بنایا۔ وہاں جا کر ایک اخبار میں کام شروع کیا اور ایک اُجڑے سے علاقے میں شب بسری کی صورت نکالی۔ لیکن ہوا یہ کہ جس غیر آباد علاقے میں ہم نے ٹھکانہ بنایا ،حُسنِ اتفاق سے پنڈی کے کم وبیش سب شاعر ادیب وہیں بس رہے تھے۔ عبدالعزیز فطرت، عبدالحمید عدمؔ اور دوسرے بہت سے شاعر، ادیب، صحافی اڑوس پڑوس میں رہ رہے تھے۔ سب سے پہلے فطرت مرحوم نے ہمارا سُراغ لگایا۔ وہ اُس وقت پنڈی کی ادبی سرگرمیوں کا روحِ رواں تھا۔ فطرتؔ کا ہمیں دریافت کرنا گویا اس شہر کی ساری ادبی آبادی میں رُسوا ہونا تھا، اور یہی ہوا کہ اُسی دن وہاں کے سب بڑے چھوٹے شاعروں ادیبوں کو ہماری آمد کا پتہ چل گیا۔ پھر فطرت نے اپنے گھر ایک دعوت کا اہتمام کر ڈالا جس میں سب اہلِ قلم مدعو تھے۔ ظاہر ہے وہاں مشاعرہ بھی ہوا اور یوں سب سے ملاقات ہوگئی۔ اُن دِنوں شاعروں کو یہ خبط تھا کہ باہر کے کسی شاعر کو پرکھنے کے لیے وہ طرحی مشاعروں کا آغاز کر دیتے۔ وہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ فطرت کے گھر کی پہلی نشست کے ساتھ ہی مستقل طور پر ہفتہ وار طرحی مشاعروں کا اُسی تقریب میں اعلان کر دیا گیا۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں عدم سے تعارف ہوا اور وہ کچھ اِس شفقت سے ملا کہ اپنا گرویدہ بنالیا۔

عدمؔ اُس وقت علامہ نیاز فتح پوری کے ادبی جریدے ''نگار'' میں باقاعدہ چھپتا تھا۔ میرا بہنوئی محمود شاہ رضوری مرحوم، نیاز فتح پوری کا پرستار اور نگار کا مستقل خریدار تھا۔ اُنھی کے ہاں میں نے ''نگار'' کی فائلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے عدم کو پہلی دفعہ پڑھا اور اس سے خاصا متاثر ہوا۔ اُس کی ایک نظم ''دوخدا'' مجھے عرصہ تک ازبر تھی۔ عدمؔ نے اس مشاعرے میں طرحی غزل پڑھی تو میں نے اُس نظم کی فرمائش کی جس پر اُس نے بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ نظم بھی سُنائی اور حاضرین کی فرمائش پر بہت سی غزلیں اور قطعات سُنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ شاید عدم کے بیشتر مداحوں اور دوستوں کے لیے یہ بات انکشاف سے کم نہ ہو کہ وہ اُن دِنوں ترنم سے پڑھتا تھا اور اُس کا ترنم اچھا خاصا تھا۔ یہ عدمؔ کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اُنھی دِنوں وہ ایران میں بسلسلہ ملازمت کچھ عرصہ گزار کر لوٹا تھا، اور ایک ماہِ عجم سے دوسری شادی رچا کر اُسے ساتھ لایا تھا اور

اُس کے حلقۂ احباب میں اُس حورالعین کے بڑے چرچے تھے۔ پھر عدم سے ہر ہفتے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شاید اُس وقت تک وہ پینے پلانے کے چکر میں نہیں تھا کیونکہ کسی دوست سے بھی اُن دِنوں اس کے اِس ہُنر کے متعلق کچھ نہیں سُنا یا اس وقت تک اِتنی رسوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت اس میں کچھ سنجیدگی اور متانت بھی تھی۔ سب سے بڑی محبت سے ملتا لیکن مل جل جانے والی، کُھل ڈُل جانے والی بات نہیں کرتا تھا۔

ہم راولپنڈی سے چند ماہ میں زادِراہ بنا کر لاہور جانے لگے تو فرداً فرداً سب دوستوں سے جا کر مِلے۔ آخر میں عدؔم سے رخصت ہونے گئے۔ اُس نے بڑی اپنائیت دکھائی۔ خاصی دیر تک ٹھہرایا۔ جی کھول کر باتیں کیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی اُس کا اوّلین شعری مجموعہ ''نقشِ دوام شائع ہوا تھا، وہ پیش کیا اور اس کی اشاعت کی پوری تفصیل سُنائی جو بڑی افسوس ناک تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ مولانا تاجور نجیب آبادی کا شاگرد تھا۔ اُس نے بتایا کہ تاجوؔر مرحوم ہی نے اُسے ''نقشِ دوام'' چھپوانے پر آمادہ کیا۔ اُن دِنوں اُنھوں نے اپنا دارالاشاعت قائم کیا تھا، اِسی اِدارے نے ''نقشِ دوام'' شائع کیا اور بقول عدم اُس نے گھر کا زیور بیچ کر مولانا کو رقم مہیا کی۔ وعدہ یہ تھا کہ چھ ماہ کے اندر وہ کتاب بیچ کر رقم لوٹا دیں گے۔ لیکن اُس کی مسلسل یاد دِہانیوں کے باوجود اُنھوں نے وعدہ پورا نہ کیا بلکہ کسی خط کا جواب تک نہ دیا۔ عدم خاصا پریشان تھا کہ اُس کی وجہ سے اُس کی گھریلو فضا متأثر ہو رہی تھی۔ اُس نے ہمیں مولانا کے نام ایک رُقعہ بھی دیا اور کہا کہ جیسے بن پڑے ہم اپنے سامنے اُن سے کم از کم نصف رقم اُسے بھجوانے کی کوشش کریں لیکن ہماری کوششیں بھی بارآور نہ ہو سکیں۔

اِن سقیم حالات کے باوجود رخصت ہوتے وقت عدؔم نے ایک لفافہ میری جیب میں ڈالا اور معذرت کرتے ہوئے کہا ''یہ حقیر سی رقم میری طرف سے رکھ لیجیے۔'' عدؔم کے اِس رویّے نے ہمیں بڑا متأثر کیا۔ ہم نے وہ رقم اُسے بڑی مشکل سے لوٹائی کہ وہ کسی صورت مانتا ہی نہ تھا۔ شاید اُسے ہمارے حالات کا پتہ چل گیا تھا اور اِس طرح اُس نے اپنی پریشانیوں کے باوجود ہماری مدد کرنا ضروری سمجھا۔ یہ اُس کی نیک دلی اور حسّاس فطرت کی ایک ایسی مثال ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ عدؔم سے میرا

خلوت و جلوت کا ساتھ رہا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی، نائو نوش کی صحبتوں میں بھی، ہوش کے جامہ میں بھی، مدہوشی کی قبا میں بھی اُسے نہایت قریب سے دیکھا اور ہر عالم میں اُسے ایک نہایت معصوم انسان پایا۔ وہ بلانوش ضرور تھا، اِس حد تک کہ مجاز تو گھڑا سامنے رکھ کر پینے کا مدّعی تھا۔ عدم تو مٹکے سے بھی سیر ہونے والا نہ تھا۔ اِس کے باوجود اُسے دوسرے شرابیوں کی طرح قے کرتے یا بہک کر اول فول بکتے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ غیر معمولی ظرف کا انسان تھا۔ جتنی پیتا جاتا اُتنی ہوش مندی کی باتیں کرنے لگتا۔ صحت نے بھی اُس کا بڑا ساتھ دیا۔ اگرچہ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے لُٹاتا رہا۔ خودکُشی کی حد تک غرقِ مئے ناب رہنا اُس کا معمول بن چکا تھا اور دو چار برس نہیں نصف صدی تک اُس کا یہی چلن رہا۔ پھر یہ بھی کہ اچھی بُری کا کوئی معیار نہیں تھا۔ نہ پینے کا سلیقہ تھا، معیار صرف یہی تھا کہ زیادہ ہو خواہ ٹھرّا ہی کیوں نہ ہو۔ اور آخر میں جب ملک میں شراب کی بندش ہوگئی اور بلیک میں خریدنا اُس کے بس میں نہ رہا تو دوسرے عادی شرابیوں کی طرح وہ بھی چرڑی ''زنجی بیرس'' سے کام چلانے لگا۔

اُن دِنوں لاہور میں حکیم یوسف حسن مرحوم کے بھائی یعسوب الحسن کا دفتر اُس کا اڈا بن گیا جو مدتوں سے ایک جنسی رسالہ نکال رہا تھا۔ یعسوب سے میری بھی دیرینہ شناسائی تھی۔ ''خضرِ راہ'' کا دفتر لاہور کے ممنوعہ علاقے میں تھا۔ جب پہلے پہل اُس سے ملاقات ہوئی، اُس وقت شعر و شباب کا مجسمہ تھا۔ ایسا تنومند کہ جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ حُسن و جمال میں بے مثال، خدوخال لازوال، خوش باش، خوش لباس، خوش خوراک، خوش مذاق۔ ہیرامنڈی کے قریب دفتر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور دفتر پر جنسی رسالے کا بورڈ دیکھ کر اُس کی شرافت پر شُبہ ہونے لگا۔ جو دوست مجھے متعارف کرانے کے لیے لایا تھا، میرا رنگ دِگرگوں دیکھ کر مسکرا کر بولا: ''گھبراؤ نہیں، آدمی شریف ہے۔ صوفیاء کے ملامتی فرقے سے ہے۔ محض اپنی شرافت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔'' یعسوب نے مسکرا کر غالب کا یہ شعر پڑھا:

سیکھے ہیں مہ وشوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

عدم کی جانے کب سے اس کے ساتھ دوستی تھی لیکن اُن دِنوں تو وہ شب و روز وہیں ڈیرے جمائے ہوئے تھا۔

کچھ دوسرے ہم مشرب دوست بھی وہاں جمع ہو جاتے اور صبح سے شام تک چڑی کا دَور چلتا رہتا۔ عدؔم شراب تو نیٹ پیتا ہی تھا، چڑی بھی نیٹ پینے لگا۔ اور یعسوب بھی اِسی رَوِش پر چل نکلا۔ نجانے کب تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ خبریں آتی رہیں، دُکھ ہوتا رہا۔۔ دونوں دوست تباہی کی طرف سرپٹ دوڑ رہے تھے جیسے کوہِ ندا کی کشش کھینچ رہی ہو۔ عدؔم سخت جان تھا وہ تو جیسے زہر پروف ہو گیا لیکن یعسوب کو ''چڑی'' لے ڈوبی۔ وہ وقت سے پہلے ہی خود اپنے ہاتھوں اپنی قیمتی زندگی گنوا بیٹھا۔ عدؔم اس کے بعد زیادہ زوروشور سے یعسوب کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے چڑی چڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ بستر سے لگ کر رہ گیا، لیکن اُس کا دل و دماغ اور ظاہری صحت اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک بحال رہی۔ لیکن آخر تابکے۔ اور پھر پچھلے دِنوں اُسے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ اور یہ طوطیٔ ہزار داستان بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموشیوں کے پاتال میں اُتر گیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اکثر شعراء شراب و شعر کو لازم و ملزوم سمجھتے ہوئے اس سے دامن نہیں بچا سکتے۔ اس میں بھی کوئی شُبہ نہیں کہ پینے کے بعد اُنھیں دُم پہ کھڑے ہوتے ذرا دیر نہیں لگتی اور نشے کی ترنگ میں اُنھیں سب انسان کیڑے مکوڑے لگتے ہیں، لیکن عدم کی بات مختلف ہے۔ اُسے آتشِ سیال نے جلا کر کُندن بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایسے عالم میں اُسے کیڑے مکوڑے بھی سانس لینے والی جاندار مخلوق نظر آتی تھی اور اُن سے بھی مخاطب ہو کر یہی کہتا: ''حضور! میں تو آپ کا خادم ہوں، مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیجیے۔ حضور! میں آپ کو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔''

عدؔم اگر غرقِ مے ہو کر نہ رہ جاتا تو اُس کے جوہر جانے کہاں جا کر دم لیتے۔ وہ غزل کی مملکت کا فاتح بن کر اُبھرا اور فتح و ظفر کا پرچم لہراتے ہوئے ادبی دُنیا میں اپنے فن کی دھاک بٹھا دی لیکن اپنے لااُبالی پن کے باعث اپنی ساکھ قائم نہ رکھ سکا اور اُس کا فن ارتقاء پذیر ہونے کے بجائے جامد ہو کر رہ گیا، تاہم اُس نے جتنی تھوڑی بہت اچھی غزل کہی ہے وہ اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے اور سربرآوردہ غزل گو شعراء کی فہرست میں وہ ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر

حضور! عدم آیا ہے

''اے'' پنکھے کی ڈنڈی جیسی اُنگلی میری طرف اُٹھی ہوئی تھی، میں چور بنا کھڑا تھا۔

''تم کرسٹان ہو؟'' جماعت کے تمام لڑکوں کی نگاہیں مجھ پر تھیں اور میری نگاہیں اپنے جوتے پر۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ گرج کر بولے: ''ننگا سر، ننگی ٹانگیں، یہ حلیہ تو کرسٹانوں کا ہے۔''

اور میں مسلمان چپ!

''کیا کرتا ہے تمھارا باپ؟''

میں نے بتایا۔ ''اگر اِس سکول میں پڑھنا ہے تو کل سے ٹوپی کے بغیر سکول میں مت آنا۔''

شرم سے میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور تب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ واقعی تمام لڑکوں کے سر پر ٹوپیاں تھیں اور ٹانگوں میں اٹکے پاجامے۔ ٹوپی بہت اچھی چیز ہے لیکن جس طرح مجرم بن کر میں اسے پہننے پر مجبور ہوا اس کا نفسیاتی ردِّعمل یہ ہوا کہ اِس سکول سے نکلنے کے بعد میں نے زندگی بھر ٹوپی کا نام نہ لیا۔ یہ پونہ کا ایک پرائمری سکول تھا جسے ایک دینی انجمن چلاتی تھی۔ یہ سکول پونہ کیمپ (چھاؤنی) میں ایک خاتون پیر حضرت باوا جان کے مزار کے پیچھے ایک میدان میں تھا۔ میں نے اس سکول میں دوسری جماعت میں داخلہ لیا تھا اور یہ بات ہے 1941ء کے آخر کی۔

میں لاہور میں انگریزی سکول میں پڑھتا تھا جہاں کلاس فیلو لڑکیاں اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے رِبن باندھتی تھیں اور اینگلو انڈین مسیں ہمیں ''بابا بلیک شیپ'' یاد کراتی تھیں۔ 1939ء جنگ شروع ہوئی تو ابا جی کو اگلے سال مِڈل ایسٹ بھیج دیا گیا۔ (وہ ملٹری اکاؤنٹس میں تھے) جہاں سال

گزارنے کے بعد واپسی پر اُن کی پونہ میں پوسٹنگ ہوگئی۔ اُن کی عدم موجودگی میں پورا سال فورٹ سنڈیمین میں گزارا۔ بالکل آوارہ گردی کرتے ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری جماعت سے اُٹھا مگر دوسری جماعت میں داخلہ ملا۔ الغرض میں ہر لحاظ سے اِس سکول سے ناخوش تھا۔ اب جو یہ نادر شاہی حکم سُنا تو گھر آ کر خوب رویا۔ شام کو ابّا جی دفتر سے آئے تو والدہ نے ٹوپی کا قصّہ سُنایا، چنانچہ ہم دونوں باپ بیٹا ٹوپی خریدنے شہر گئے جہاں سیاہ رنگ کی ٹوپی خرید کر بس پر سوار ہونے لگے تو اِس دھکم پیل میں کسی نے ابا جی کا بٹوہ پار کرلیا۔ یہ مہینے کی اِبتدائی تاریخیں تھیں، یوں بٹوے کے ساتھ پورے مہینے کی تنخواہ بھی گئی۔ (میں ٹوپی سے اور بھی زیادہ متنفر ہوگیا) ناچار ہم دونوں پیدل گھر چلے۔

''قاضی صاحب! قاضی صاحب!''

ابّا جی آواز سُن کر رُک گئے اور ایک صاحب جھومتے جھامتے آ کر اُن سے لپٹ گئے۔ یہ عدمؔ تھے۔ مجھے اُس وقت تو معلوم نہیں تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ انسان جب پی لیتا ہے تو نہ صرف جھوم کر ہی چلتا ہے بلکہ دل کا دروازہ بھی کُھل جاتا ہے۔

عدمؔ صاحب کو ٹوپی نامہ سُنایا گیا اور جب یہ سُنا کہ جیب کٹ جانے کی وجہ سے ہم پیدل مارچ کرتے گھر جارہے ہیں تو پہلے خوب ہنسے، پھر ہمیں زبردستی ایرانی ریستوران میں لے گئے۔ (پونہ میں زیادہ تر ریستوران اور چائے خانے ایرانیوں کے تھے) چائے پلائی اور مجھے زبردستی ایک بڑا سارس کھلایا۔ اُس کے بعد پیدل چل کر ہمیں دُور تک چھوڑنے آئے۔

یہ تھا سیّد عبدالحمید عدمؔ سے میرا پہلا تعارف!

ابّا جی اور عدمؔ صاحب دونوں ہم نام بھی تھے، ہم کار بھی اور ہم مشرب بھی!

ہم پونہ کیمپ میں بھگوان داس چال میں رہتے تھے۔ (مجھے سڑک کا نام تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ اُس کے پاس ''رین بوٹا کی'' نام کا ایک سینما تھا) چال ایک لمبی گلی تھی جس میں دورویہ ایک جیسے مکانات تھے جن کی ٹین کی ڈھلوان چھتوں پر موسموں کی مار کھائے سیاہ کھپریل لگے ہوئے تھے۔ اِس چال میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، مرہٹے سبھی آباد تھے۔ شام کو پارسنیں گلی میں اپنے دروازہ

کے سامنے والے حصہ پر باریک جھاڑو دے کر چونے سے نقش و نگار بنا لیتیں۔ پاس کے ایک گھر میں ایک سکھ مرد ''ڈھیر'' عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ (وہ یقیناً بلا شادی کیے آباد ہوں گے) ایک گھر میں ایک اکیلا برہمن تھا جو سپیروں کے سانپوں کو دودھ پلایا کرتا تھا۔ ہمارے دائیں ہاتھ کے پڑوس میں میرے ہم عمر دوست تین چار بہن بھائی تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ کی بھی پانچ اُنگلیاں نہ تھیں، یا چار یا چھ جبکہ بائیں ہاتھ کے پڑوس میں سانولی سلونی کئی لڑکیاں تھیں جن میں ایک کام کرتے وقت اِنّا للہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون نہایت سُر کے ساتھ با آوازِ بلند پڑھتی رہتی تھی۔ چال کے دروازے پر وقتاً فوقتاً سیندور کے دائرہ میں تانبہ کا پیسہ اور مٹھائی کا ٹکڑا دھرا ہوتا، یہ ٹونا تھا۔ ہندو لڑکے تو راستہ کاٹ کے گزرتے مگر مسلمان لڑکے مٹھائی کھا لیتے، پیسہ جیب میں رکھتے اور سیندور کے دائرہ پر پیشاب کی دھار مارتے۔ الغرض پونہ صحیح معنوں میں Exotic تھا۔

پھر یہ ہوا کہ ہمارے مکان کے عین سامنے کا مکان عدمؔ صاحب نے لے لیا۔ ابّا جی بہت خوش تھے کہ دوست ساتھ آ گیا۔ والدہ خوش تھیں کہ ایک سہیلی مل گئی۔ میرے لیے کیونکہ اس گھر میں کوئی ہم عمر لڑکا نہ تھا، اس لیے مجھے اس مکان میں عدمؔ صاحب کے آباد ہونے یا نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہ پڑتا، لیکن اب میں اُس زمانہ کو یاد کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں غالباً اُن چند لوگوں میں سے ہوں جو اُن کی پونہ میں گزری زندگی کے اُس پہلو سے واقف ہوں گے جس کے بارے میں اب جاننے والے بہت ہی کم ہوں گے۔

ابّا جی کی مانند عدمؔ بھی ملٹری اکاؤنٹس میں تھے اور سال بھر کے لیے مڈل ایسٹ بھیجے گئے تھے۔ وہاں ایران اور عراق میں اُن کا قیام رہا اور دراصل وہیں ابّا جی اور عدمؔ کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ جن دِنوں عراق میں تھے تو اُن کا ایک عراقی کُنبہ میں آنا جانا ہو گیا جہاں عدمؔ ایک خاتون کے ساتھ اٹک گئے۔ یہ ملکیہ تھی جسے واپسی پر یہ اپنے ساتھ ہی لیتے آئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ بیوہ تھی اور شاید بغداد میں ایک بچہ چھوڑ کر اُن کے ساتھ آئی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا تھا اور شاید چیچک کے داغ بھی تھے۔ فراک پہنتی تھی اور اُس زمانہ کا مشہور سگریٹ ''پاسنگ شو'' پیتی تھی۔ یہ مجھے اِس لیے یاد ہے کہ

بالعموم سگریٹ میں ہی بازار سے لاکر دیا کرتا تھا۔ والدہ سے اُس کی بہت دوستی تھی۔ یا وہ ہمارے گھر آ کر دن بسر کر دیتی یا والدہ اُن کے ہاں چلی جاتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دونوں اپنی اپنی بالکنی میں کھڑی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ملکیہ کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے زیادہ تر آزاد رہتی، مثلاً دوپہر کا کھانا میں اُسے ایرانی ریستوران سے لاکر دیا کرتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے وہ قیمہ کی زیادہ شوقین تھی کیوں کہ بار بار قیمہ لانے سے تنگ آ کر ایک دن میں نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا جس پر مجھے خاصی ڈانٹ بھی پڑی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ عدؔم کے ساتھ ابّا جی نے بھی گھر دیر سے آنا شروع کر دیا اور ہمارے گھر میں عجیب سا تناؤ رہنے لگا جسے کم عمری کے باوجود میں نے بُری طرح محسوس کیا۔ عام لوگ بچوں کو نادان سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت اِس کے برعکس ہے کہ بچوں کے Tantacles بہت دُور کی خبر لاتے ہیں۔ بچوں میں ایک خاص طرح کی چھٹی حِس ہوتی ہے جو بہت کچھ دیکھے بغیر ہی اُنھیں بہت کچھ سمجھا دیتی ہے۔ میں ہمیشہ سے Precosious رہا ہوں، لہٰذا میرے Tantacles کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حسّاس تھے۔ دونوں بیویاں سر جوڑے کُڑھتی رہتیں۔ مجھے یاد ہے اُس زمانہ میں میری والدہ غصہ سے عدؔم کو ہمیشہ ''ادّم'' کہا کرتی تھیں لیکن صابر وشاکر تھیں جب کہ ملکیہ کی غصیلی آواز اور میموں جیسی غلط اُردو آدھی رات کو ساری چال میں گونجتی، جب عدم آدھی رات کا سورج بن کر طلوع ہوتا۔ 1941ء کے پونہ میں پینا پلانا کوئی اہم مسئلہ نہ تھا، جو شراب نہیں پیتے تھے وہ ''تاڑی'' پی کر آتے، مثلاً سامنے والا سکھ جب تاڑی پی کر آتا تو رات کو اپنی ''ڈھیر'' عورت کو ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ وہ غصہ میں اُسے گالیاں نکالتی لیکن جب یوں تسکین نہ ہوتی تو Moreover کہہ کر مرہٹی میں شروع ہو جاتی، لیکن عدؔم نے رات کو دیر سے گھر آ کر کبھی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اول تو جلی بھنی ملکیہ دروازہ ہی نہ کھولتی جبکہ شرابی کے ذہن والی یکسوئی کے ساتھ یہ صابر وشاکر زنجیر ہلاتے رہتے۔ اس کے بعد جب بالآخر دروازہ کھل جاتا تو طوفان بن کر اُن کا استقبال کرتی۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔ بعض اوقات وہ غصہ میں کوئی چیز دے مارتی۔ ایک مرتبہ دھکا دیا تو سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے آ پڑے۔ اب تک یاد ہے کہ ایک رات اُس نے اُن پر سلائی مشین اٹھا کر پھینکی تھی۔ چنانچہ مشین اور عدؔم نے اکٹھے سیڑھیاں طے کیں

جس کے نتیجہ میں دونوں میں چپ پڑ گئے۔ اس نوع کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ اگر چہ سامنے کے گھر میں سکون رہتا لیکن وہاں جولڑ کا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اُس کی ایسی Condition ہورہی تھی کہ عمر بھر وہ کسی نشہ کے قابل نہ رہا، حتیٰ کہ زندگی کے ایک دَور میں جب پینے کی کوشش بھی کی تو نشہ تک نہ ہو سکا۔

ایک مرتبہ رات نہ جانے کس سے جا ٹکرائے کہ گھر پہنچے تو خون میں لت پت مگر کیا مجال جو جھومنے میں فرق آیا ہو بلکہ وقت تو یہ احساس تک بھی نہ تھا کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں اور صبح اُٹھ کر جب زخم دیکھے تو یاد تک نہ تھا کہ یہ زخم کس نے لگائے اور کیوں لگے۔

اتوار کو دونوں دوست مارکیٹ میں سبزی گوشت وغیرہ لینے جاتے۔ پونہ میں بیشتر کاروبار عورتوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ چھوٹی موٹی دوکانیں تک بھی عورتیں ہی کرتی تھیں۔ چنانچہ مارکیٹ میں سبزی بیچنے والی تمام عورتیں ہی تھیں۔ شاید یہ پڑھ کر بڑا رومینٹک محسوس ہو کہ عورتیں سودا بیچتی تھیں اور مرد خریدتے تھے۔ گویا ایک طرح کا مینا بازار ہو گیا لیکن مرہٹی عورت اور بالخصوص نچلے طبقہ کی ''دھیڑ'' عورتیں کوئی ایسی خوب صورت نہ ہوتی تھیں۔ چھوٹے قد، گھٹے ہوئے دوہرے جسم اور پکے رنگ، بہت چھوٹا بلاؤز پہنتیں جو کمر پر صرف ایک ڈوری سے بندھا ہوتا۔ ساڑھی کا ایک پلّو پیچھے کمر میں یوں کس کر لٹکا لیتیں کہ اگر آج کوئی ویسی دیسی ساڑھی پہن کر قصّہ خوانی سے گزر جائے تو ہالی ہل ڈک لین۔ بہر حال کاروبار عورتوں کے ہاتھ میں تھا اور مجھے یاد ہے کہ مارکیٹ کی سب سے جوان اور خوب صورت عورت سے سبزی خریدی جاتی تھی۔ (میں نے کہا نا میرے Tantacles اُس زمانہ میں بہت حسّاس تھے) پھر یوں ہوا کہ پونہ سے دفتر ختم کر کے انبالہ چھاؤنی منتقل کر دیا گیا۔ چنانچہ دفتر کے بابو لوگوں کے لیے خصوصی گاڑی چلائی گئی جس نے کوئی چھ دن میں یہ سفر تمام کیا۔ انبالہ شہر میں اگر چہ دونوں گھروں کے مکانات الگ الگ محلوں میں تھے لیکن آنا جانا بدستور تھا۔ اِس دوران میں راولپنڈی سے اُن کی پہلی بیگم بھی بچوں کے ہمراہ آ گئیں اور ملکیہ کو الگ مکان میں رکھا گیا۔ انبالہ میں میرے مطالعہ کا آغاز ہو چکا تھا بلکہ بچوں کے رِسالوں میں میری ایک آدھ کہانی بھی چھپ چکی تھی۔ مطالعہ کی لت کا یہ

عالم تھا کہ کتاب یا رسالہ میں دیمک بن کر گھس جاتا۔ اب تک مجھے عدؔم صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ ابّا جی اگرچہ خود تو نہ لکھتے تھے لیکن کئی ادیبوں سے اُن کی دوستی تھی۔ میرا شوق دیکھ کر وہ بعض اوقات مجھے ادبی محفلوں میں بھی لے جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں میں نے نوجوان ابنِ انشاء کو بھی دیکھا تھا۔ ابنِ انشاء کی ابّا سے علیک سلیک تھی ۔ چنانچہ جب سکول میں ایک تقریری مقابلہ میں شرکت کے لیے مجھے تقریر کی ضرورت پڑی تو ابّا جی نے ابنِ انشاء سے وہ تقریر لکھوائی جسے میں نے خوب رٹ رٹا کر سامعین کے سامنے اُگل دیا۔ (مگر انعام پھر بھی نہ ملا) بعد میں میں انشاء جی سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اُنھیں تقریر لکھ کر دینا یاد تھا، بہت ہنسے!

جس طرح ہر لکھنے والا شاعری سے آغاز کرتا ہے اُسی طرح میں نے انبالہ میں کچھ انٹ شنٹ کیا جو ابّا جی نے عدؔم کو دکھایا۔ اُنھوں نے نہ صرف ان نثری نظموں کو پابند نظموں میں تبدیل کر دیا بلکہ ابّا جی سے کہا کہ اِس لڑکے میں بہت Spark ہے۔ (مجھے اب تک یہ لفظ یاد ہے) اور اگر اسے رہنمائی میسّر آ گئی تو ایک نہ ایک دن کچھ نہ کچھ بن جائے گا۔ اب سوچتا ہوں یہ عدؔم صاحب کی اعلیٰ ظرفی تھی ورنہ پانچویں چھٹی کے طالبِ علم کی کیا بساط اور کیا اس کا Spark!

تقسیمِ ملک کے بعد جب ہم 25 دسمبر، 1947ء کو لاہور پہنچے مگر اپریل 1948ء میں ابّا جی کا تبادلہ راولپنڈی کر دیا گیا۔ عدؔم صاحب ہم سے پہلے ہی راولپنڈی آ چکے تھے۔ اُس وقت اُن کا مکان اصغر مال کی طرف تھا۔ یہاں بھی گھروں کا میل ملاپ جاری رہا لیکن میں دوسرے تیسرے دن پہنچا ہوتا۔ ایک تو اپنی بے وزن شاعری درست کرانے کے لیے لیکن اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عدؔم صاحب کے پاس اُردو کے تمام اچھے پرچے جیسے ''سویرا''، ''ادبِ لطیف''، ''نقوش'' اور دیگر بے شمار پرچے آتے تھے، میں جاتا اور جو کچھ ہاتھ لگتا اُٹھا لاتا۔

اُن دِنوں وہ عام طور پر شام کو گھر پر ہی رہتے اور وہیں پینے پلانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ ہنڈیا بھونتے وقت اندر سے سالن کی پلیٹ آ جاتی، یہ نہ ملتی تو نمک سے کام چل جاتا۔ اُن کے دوست آتے تو میں جھجک کر اندر چلا جاتا۔ اکیلے ہوتے تو اُن کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ وہ پیتے، باتیں

کرتے، شعر کہتے، شعر سُناتے۔ اب میں سوچتا ہوں تو اس پر تعجّب ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کبھی اس طرح کی احتیاط نہ کی کہ میرے سامنے نہ پیتے یا بوتل کھولتے وقت مجھے بھگا دیتے۔ شراب اُن کے لیے معمولِ حیات تھی، یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن میرے والدین نے بھی مجھے وہاں جانے سے کبھی نہ منع کیا۔ شاید ابّا جی کو اپنے دوست پر اِتنا اعتماد تھا کہ وہ ان کے بیٹے کو خراب نہ کرے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ عدؔم صاحب کی اور میری دوستی نہ تھی۔ اِس لیے گفتگو یک طرفہ ٹریفک والی بات تھی۔ عدؔم صاحب ہی کچھ بولتے تو بولتے، اُن کے ذہن کی رَو اُنھیں جدھر لے جاتی اُدھر چل دیتے۔ بعض اوقات وہ اشعار بھی کہتے اور میں دم سادھے بیٹھا رہتا۔ ایک گھونٹ پیتے، گنگناتے اور پھر شعر کاغذ پر لکھ لیتے۔ اُن کے ایک بیٹے کی آواز اچھی تھی، زیادہ ترنگ میں آتے تو اُس سے اپنے اشعار سُنتے اور جھومتے۔

ایک مرتبہ اُنھوں نے اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں بتایا کہ اُن کے ایک عزیز دوست کا انتقال ہو گیا جس کا غالباً عبدالحمید ہی نام تھا۔ یہ اُسے دفن کر کے آئے تو ذہن پر بہت بوجھ تھا اور اِس عالم میں ایک نظم اُس کی موت پر لکھی۔ شاید یہ نظم کہیں نہ چھپی اور تلف ہو گئی ہو۔ اِسی طرح ایک مرتبہ اُنھوں نے اپنی شاعری اور شراب کے لازم و ملزوم ہونے پر ایک شعر پڑھا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی غزل میں شامل ہے یا نہیں، کیونکہ مجھے یہ فی البدیہہ محسوس ہوا تھا۔ مجھے یہ شعر غالباً درست صورت میں یاد نہیں، بہر حال شعر کچھ یوں تھا:

میرے شعروں کی ندی دورِ خوں سے بہتی ہے
ایک مصرع شباب کہتا ہے، ایک مصرع شراب کہتی ہے

عدؔم صاحب کوئی ایسے خوش لباس نہ تھے مگر گھر میں تو بالکل ہی بے نیاز ہوتے تھے۔ عام طور سے بنیان اور دھوتی پہنتے، جب شراب کی گرمی زیادہ چڑھتی تو بنیان بھی بار ہو جاتی، ادھر دھوتی بھی باقاعدہ دھوتی نہ ہوتی بلکہ بالعموم یہ بستر کی چادر ہی ہوتی تھی۔ عدؔم صاحب زیادہ تر باہر بیٹھک میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے آ کر جو بیٹھک کا دروازہ کھولا تو وہ اس عالم میں سو رہے تھے کہ چادر مکمل

طور پر کھل چکی تھی۔ میں نے جو یہ ہوش رُبا منظر دیکھا تو آنکھیں بند کر کے بھاگا۔

بہرحال میرا آنا جانا اسی طرح جاری رہا۔ اگرچہ شعر کہنے کا شوق سرد پڑ گیا تھا لیکن رسالوں کی خاطر آتا جاتا رہا۔ لیکن ایک بات ہے کہ میں نے اپنے بے تکے انداز میں جو کچھ بھی لکھا، اُنھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اُس کی چولیں درست کیں۔ اسی دوران اُنھوں نے کچھ ایسے شعر کہے جو اُس زمانہ کے ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کو غیر اسلامی لگے چنانچہ بطور سزا عدم کا تبادلہ بطور سزا غالباً جہلم کر دیا گیا اور یوں میں اُن کی زندگی کے مدار سے نکل گیا اور ایسا نکلا کہ پھر قرانِ سعدین نہ بن سکا۔

شاؔد امرتسری

سیّد عبدالحمید عدم

۱۹۴۵ء کی سردیوں کی ایک شام کا ذکر ہے میں فلیمنگ روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی سٹال میں چائے پی رہا تھا کہ چائے خانہ میں مراتب علی تائب داخل ہوئے کہ اُن سے ہر شام وہاں ملاقات ہوتی تھی۔ اُن کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص سگرٹ کو انگوٹھے اور دو اُنگلیوں میں تھامے جھومتا جھامتا اندر گھس آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، تو ند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے از خود اُس کے جسم پر اٹک گئے ہوں۔ بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب، پاجامہ نما پتلون ڈھلکی ہوئی جس کو وہ بار بار ہاتھ سے پکڑ کر اُونچا کرتا تھا۔ گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا۔ چہرہ مسکراتا ہوا اور آنکھوں میں ایک معصومانہ چمک۔ پیشتر اِس کے کہ میں کچھ سوچتا کہ آج تائب صاحب اپنے ساتھ کیا شے لے آئے ہیں اُنہوں نے مجھ سے کہا: ''شاد صاحب! آپ ہیں عدؔم صاحب، یعنی سیّد عبدالحمید عدؔم، اُردو کے مشہور شاعر۔'' میں یہ سُن کر بھونچکا سا رہ گیا کہ اِس ڈیل ڈول کا شعر سے کیا تعلق ہوسکتا ہے مگر اِتنے میں عدؔم صاحب نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا: ''حضور! آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔'' اِتنا کہا اور بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ میں نے چائے منگانا چاہی مگر عدؔم صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے کہا: ''حضور! یہ چائے کا وقت نہیں اب تو شام ہو رہی ہے۔'' یہ کہا اور پھر نہایت بے تکلفی سے داد طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ تائب صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوئی تو ہم تینوں ٹی سٹال سے نکلے۔ باتیں کرتے کرتے اور چلتے چلتے میکلوڈ روڈ تک پہنچے تو عدؔم صاحب جھٹ قلعہ گوجر سنگھ کے باہر والی دیسی شراب کی دُکان کی طرف لپکے۔ میں اور تائب صاحب بھی ہچکچاتے ہوئے دکان کے اندر داخل ہوئے۔ عدؔم صاحب بوتل کو ہاتھوں میں تھامے کھڑے تھے اور اُن کے چہرے سے کچھ اِس قسم کی معصومانہ مسرت ٹپک رہی تھی جو

ایک بچے کو اُس کی پسند کا کھلونا مل جانے پر ہوتی ہے۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹ بغل میں دبا عدؔم صاحب بولے: ''حضور! یہیں بیٹھ جائیں؟'' میں اُن دِنوں دیال سنگھ کالج کا طالب علم تھا اور بعض وجوہ کی بنا پر رام موہن رائے ہوسٹل چھوڑ کر دل محمد روڈ پر ہی ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن کسی دفتر میں ملازم تھے۔ امرتسر کے تھے اور میرے عزیز دوست۔ میں نے دیسی شراب خانے میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا: ''عدؔم صاحب! گھر چلتے ہیں۔'' عدؔم صاحب کو جیسے کسی نے بہشت کی خوش خبری دے دی، سبحان اللہ کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

بوتل کھولی گئی۔ اِس سے پہلے میں نے دیسی شراب کبھی نہیں پی تھی مگر عدؔم صاحب نے اِس خلوص اور بے تکلفی سے دعوت دی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ ٹھرّا نہیں۔ چند ہی منٹ کے بعد شراب کا اثر ہوا اور عدؔم صاحب نے ازخود اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ایک، دو، تین، چار اور معلوم نہیں کتنی غزلیں سُنا ڈالیں۔ دَور چلتا رہا اور شعر ہوتے رہے۔ یہ محفل کافی دیر تک رہی اور آخر عدؔم صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھے اور تائب صاحب کو اُنھیں پکڑ کر ٹانگے میں لادنا پڑا۔

عدؔم صاحب سے بظاہر یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بہت دیرینہ دوست ہیں اور عرصے بعد ملے ہیں۔ دوسرے روز شام کے قریب میں گھر پہنچا تو عدؔم صاحب کو موجود پایا۔ میری غیر حاضری میں وہ میرے دوست اور میرے کمرے کے ساتھ مسٹر حسن سے نہ صرف اپنا تعارف کرا چکے تھے بلکہ نہایت بے تکلفی سے محوِ گفتگو تھے اور اُنھیں اپنی کئی غزلیں بھی سُنا چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی عدؔم صاحب نے اِس طرح اُٹھ کر میرا استقبال کیا جیسے وہ صاحبِ خانہ ہوں اور میں ایک مہمان کی حیثیت سے اُن کے گھر آیا ہوں۔ تھری ایکس رَم کی بوتل میز پر کھلی پڑی تھی اور اُس کی بُو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن (جو اب بھی میرے ہمسائے ہیں) شراب بالکل نہیں پیتے مگر پینے والوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ ان کے لیے ساز و سامان فراہم کرنا سعادت تصوّر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک پلیٹ میں کچھ کباب بھی پڑے ہوئے تھے۔ اُن دِنوں ہمارے کمرے میں جس کا نام ہم نے پاکستان لاج رکھا ہوا تھا، شام کو روزانہ محفل آراستہ ہوتی تھی۔

مختلف قسم کے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، مراتب علی تائب، لطیف انور اور ہمارے ایک کرم فرما مسٹر خلیل شام ہوتے ہی چلے آتے۔خوش گپیاں ہوتیں۔خلیل صاحب لطیفہ بازی اور بذلہ سنجی سے ہمیں نوازتے۔سیف صاحب کلام سُناتے، اُن سے بحثیں ہوتیں۔ظہیر کاشمیری سے کیمونزم پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔علم وادب کی باتیں ہوتیں اور گاہے گاہے شراب کا دَور بھی چلتا۔میرے دوست مسٹر حسن تاش کے بہت شوقین ہیں۔اُن کے بھی کچھ دوست احباب آ جاتے۔وہ الگ تاش میں مصروف رہتے اور ہم اپنے کام میں مگن گویا یہ کمرہ صحیح معنوں میں سعدی کے اِس شعر کی تفسیر تھا:؎

بہشت آں جا کہ آزارے نبا شُد
کِسے را با کِسے کا رے نبا شُد

عدؔم صاحب کے آنے سے اُس روز کی محفل میں ایک نمایاں فرق یہ پڑا کہ شراب روز آنے لگی اور اکثر اوقات عدؔم صاحب اپنے ساتھ ہی بوتل لے آتے۔وہ باقاعدہ شام ہوتے ہی دفتر سے سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے۔عدؔم صاحب شراب کے ساتھ ساتھ بیسیوں غزلیں بھی سُناتے جاتے۔ہمیں غزلوں سے اور خود کو شراب سے بے ہوش کرتے۔عدؔم صاحب کا حافظہ بہت تیز ہے اور انھیں اپنی سینکڑوں غزلیں یاد رہتی ہیں اور خاص طور پر شراب پینے کے بعد تو انھیں تمام بھولے بِسرے سُر بھی یاد آ جاتے ہیں۔

عدم صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ شراب کے بغیر اُن کی شخصیت بالکل بے معنی ہے۔اس کے بغیر وہ بُدّھو اور سخت بور دکھائی دیتے ہیں۔ان کی گفتگو بے جان، بے معنی اور عامیانہ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ کسی بھی حسین شَے سے ایسی حالت میں متاثر نہیں ہوتے۔ان کا ایک شعر اِس سلسلے میں سُنیے:؎

شراب پی کے مجھے آنکھ کھولنے نہ دے　　　ابھی چمکتے ہوئے رُخ کو بے نقاب نہ کر

یوں بھی عدؔم صاحب کا علم وادب کا مطالعہ بہت محدود ہے۔وہ کسی ادبی یا فنی نظریے یا کسی

مکتبِ خیال کے اصولوں سے پوری طرح شناسا نہیں ہیں اور یہ اِس لیے نہیں کہ اُنھوں نے کسی نظریے یا کسی مکتبِ فکر کے اصولوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اِس لیے کہ وہ خود کو بہت عالم سمجھتے ہیں بلکہ اِس لیے کہ اُن کا مزاج ہی کچھ اِس قسم کا لا اُبالی واقع ہوا ہے کہ وہ کسی سنجیدہ قسم کے ادب یا نظریے کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ شروع سے ہی اُنھوں نے سائنس کی تعلیم پائی۔ حساب کے مضمون سے بہت دلچسپی رہی۔ بی اے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔ اے۔ ایس کے امتحان میں (سبارڈی نیٹ اکاؤنٹس سروس جو بک کیپنگ اور اکاؤنٹنسی کا امتحان ہوتا ہے) دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر اس طرح سے دفتری کام میں محو ہوئے کہ اُنھیں ادبیات کا مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

عدؔم صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اُن کی سادگی اور معصومیت ہے۔ معصومیت کا لفظ میں روایتی طور پر استعمال نہیں کر رہا بلکہ اگر اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ عدؔم صاحب کی شخصیت میں محض معصومیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ زندگی کا ہر پہلو چاہے وہ نجی ہو، دفتری ہو یا اُن کے فن کے متعلق ہو اُن کی شخصیت کی اس خصوصیت سے بہر حال اثر پذیر ہوتا ہے۔ اُن کی طبعی سادگی اِس حد تک ان کی زندگی میں رچ گئی ہے کہ بعض اوقات یہی معصومیت اور سادگی ان کے دوستوں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں تا کہ ان کی سادگی اور معصومیت کا تکلیف دہ ہونا آپ پر بھی ثابت ہو سکے۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں جب لاہور میں فسادات شروع ہو چکے تھے لاہور میں روزانہ شام کے وقت کرفیو نافذ ہو جایا کرتا تھا۔ اُن دِنوں ہماری شام کی محفلوں میں احباب کی کمی کا شدید احساس ہوتا تھا مگر عدؔم صاحب قریب قریب بلا ناغہ آتے تھے اور چونکہ کرفیو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے نافذ ہو جاتا تھا اِس لیے بعض اوقات گھر واپس جانے کی بجائے میرے گھر ہی سو جایا کرتے تھے۔ انھی دنوں عدؔم صاحب دو تین روز کے لیے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے: ''حضور! ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے۔'' میں حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ کہنے لگے: ''میں اِسی

لیے تین چار دنوں سے نہیں آیا۔ حضور! بات یہ ہے کہ میرے پاس اُس دن ایک بوتل رَم کی اور چھ بوتلیں بیئر کی تھیں۔ میاں میر سے کوئی ٹانگے والا لاہور آنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک ٹانگے والے کو میں نے آمادہ کر ہی لیا۔ رَم کی بوتل اور بیئر ساتھ تھی۔ راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا۔ پولیس نے ٹانگے والے کا چالان کر دیا۔ بوتلوں پر قبضہ کر لیا اور مجھے کوتوالی میں لے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست شاد امرتسری کے لیے لے جا رہا تھا۔ حضور! آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا پڑے گا تا کہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس مل جائے ورنہ حضور! شراب مُفت میں حرام ہو جائے گی۔'' چنانچہ میں کئی دن ان کے ساتھ اس مصیبت میں مبتلا رہا اور خدا خدا کر کے قصّہ پاک ہوا۔ اِسی قسم کے بیسیوں واقعات ہوں گے جہاں اُن کی سادگی اور معصومیت نے کسی نہ مصیبت سے دو چار کیا۔

عدؔم صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ انھیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو ان کے چہرے سے اِس طرح عیاں ہو جاتا ہے جس طرح ایک ڈرپوک بچے کو جھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید انھی فطری اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ان کے شعروں میں صداقتِ احساس اور خلوصِ اظہار ہوتا ہے ورنہ ان کی تجرباتی زندگی کا میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی اور کُل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار متنوع پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ریا کار، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح نا آشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں دے نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کے مقلّد نہیں۔ ان کی آزادیٔ طبع اور آزادیٔ فکر کسی ضابطے کی متحمّل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اِس آزادی بلکہ آزادہ روی کی وجہ ان کا طبعی لااُبالی پن ہے۔ میں نے اکثر

غور کرنے کی کوشش کی کہ انھوں نے شراب نوشی کو اِس طرح اپنے آپ پر سوار کیوں کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سوائے اِس کے کہ یہ بھی زندگی کے ساتھ ان کے غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار ہے۔ یہ بے راہ روی اور لاا ُبالی پن اِس طرح مستقل صورت اختیار کر چکا ہے کہ عدم صاحب اس کے اثر سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ عدؔم صاحب نے کہیں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا۔ یعنی کیا یہ بے راہ روی ان کی زندگی اور ان کے فن کا نمائشی پہلو تو نہیں مگر ہر بار مجھ پر عیاں ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لا اُبالی پن اور ایک فنکارنہ وارفتگی ان کی شخصیت کا ایک فطری جزو ہے۔ یہ محض سونا ہے اس پر سہاگہ نہیں۔ یہ کوئی ملمّع نہیں بلکہ اصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت کچھ اور یوں بھی واضح ہوئی جب ان کے تصوّرِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگیا وہ ایک اور فقط ایک جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن اور جذبات واحساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کرتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب ان کی وہی فطری بے راہ روی اور طبعی لا اُبالی پن ہے۔ عدؔم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق و پجاری ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حسن پرستی اگر چہ ایک معمولی قسم کے حسّاس انسان کی حُسن پرستی نہیں تاہم اِس حُسن پرستی میں وہ تڑپ اور دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا غم، ایک دردمندی اور ایک ابدی دل سوزی پیدا ہوتی ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ میں گوہرِ مراد آبدار ہوتا ہے۔ مگر اِس دردمندی اور کیفیتِ غم کی غیر موجودگی نے عدؔم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انھوں نے اپنے آپ کو آتشِ سیّال کی بھٹی میں ڈال کر کُندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

عدؔم صاحب کی وارفتگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اِس لیے کہا ہے کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ ۱۹۴۷ء ہی کا ذکر ہے، اُن دِنوں لاہور میں فسادات بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور عدؔم صاحب میرے

گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب صبح ہونے والی ہوگی کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا تو کمرے میں بتی جل رہی تھی اور کمرہ دُھویں سے بھرا ہوا تھا۔ ظہیر کاشمیری مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عدؔم صاحب کا تکیہ بالکل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے، یہاں تک کہ عدؔم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں مگر انھیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بصد مشکل میں نے اور ظہیر کاشمیری نے عدؔم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ عدؔم صاحب کو یہ معلوم کر کے بالکل حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے: ''حضور! ایسا تو کئی بار ہوا ہے۔'' یہ کہا اور ایک اور سگرٹ جلا لیا۔ خیر کچھ دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اُٹھے تو دیکھا کہ عدؔم صاحب کی قمیص جل رہی ہے مگر وہ بالکل بے سُدھ پڑے ہیں۔ پانی کا گلاس اُن کی قمیص پر ڈالا گیا مگر اُنھیں ہوش نہ آیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے کہا کہ اگر میں رات کو نہ جاگتا تو صبح اخبار میں خبر چھپ جاتی کہ سکھوں نے تین شاعروں کو جلا ڈالا۔ اِسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ انھی دِنوں کا ذکر ہے، ایک شام عدؔم صاحب تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ الطاف مشہدی بھی تھے۔ دَور چلا۔ شراب ختم ہوئی تو الطاف مشہدی کے کہنے پر عدؔم صاحب ان کے ساتھ تلاشِ شراب میں نکل کھڑے ہوئے۔ اُن کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا پھر میں سو رہا۔ صبح سویرے اُٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عدؔم صاحب نشے میں دُھت چلے آ رہے ہیں۔ مُنہ سُوجا ہوا، کلّوں پر نیلے نیلے داغ، پتلون پھٹی ہوئی۔ میں نے پوچھا حضرت کیا معاملہ ہے؟ الطاف کہاں چلا گیا۔ لیکن چونکہ نشہ بہت تھا کوئی معقول جواب نہ دیا اور لیٹ گئے۔ میں نے اُن دِنوں سیکرٹریٹ میں عارضی ملازمت کر لی تھی۔ میں دفتر جانے کی تیاری کر چکا تو تائب صاحب آ گئے۔ اتنے میں عدؔم صاحب جاگے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ''حضور! میں مر گیا۔ حضور! میں وفات پا جاؤں گا۔'' تائب صاحب اور میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے گھر پہنچایا۔ چند روز بستر میں رہے۔ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرنے کی بجائے پانچ روز مسلسل صبح و شام ٹھرّا پیا اور ٹھیک ہونے پر بتایا کہ حضور اُس رات الطاف مشہدی کے ساتھ انارکلی میں ایک سکھوں کے

ہوٹل میں شراب کی جستجو میں جا پہنچے۔تھوڑی سی مل گئی۔سکھوں سے کسی بات پر تُو تُو میں میں ہوئی تو میں نے ہوٹل کی بالکونی سے جان بچانے کی غرض سے چھلانگ لگا دی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے کب اور کیوں چھلانگ لگائی۔

وارفتگی کے سلسلے میں یاد آیا کہ عدمؔ صاحب اکثر بچوں کی طرح پیسے گُم کر دیتے ہیں۔کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ خریدنے کے لیے جیب میں سے روپے نکالے اور کئی نوٹ گرا دیے۔اِسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لُطف یہ کہ انھیں اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے ہیں۔اُن کے کوٹ اور پتلون کی تہہ اکثر خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اکثر اُن کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک مُنہ بھی نہیں دھوتے۔صبح اُٹھے،کلّی کی اور دفتر چلے گئے۔جب تک جیب میں پیسے ہوں گھر کا رُخ نہیں کرتے۔کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ میرے گھر پڑے رہے۔بڑا لڑکا خالد بار بار آیا اور ہر بار اُنھوں نے کہا بیٹا میں آج ضرور آؤں گا۔ایک دفعہ اُنھوں نے خود ایک واقعہ سُنایا۔مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔کوئی پانچ سو روپیہ تنخواہ لے کر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچ سو روپے شراب اور عورت کی نذر ہو گئے۔صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی۔یہ کہنے لگے کہ کسی جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی ہے۔ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔لڑائی ہوئی اور بصد مشکل اُسے منایا۔اِسی طرح ان کی بے راہ روی اور وارفتگی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔اسی وارفتگی نے اُن کے کردار میں کئی خوبیاں بھی پیدا کی ہیں۔اِسی مستی اور رِندی نے اُنھیں معصوم بنایا ہے۔شراب کی ایک بُری عادت (میں ذاتی طور پر تو اِسے بُرا بھی نہیں سمجھتا) نے ان کی تمام انسانی برائیوں کو ختم کر دیا ہے اور انھیں خلوص کا پیکر بنا دیا ہے۔وہ دوستوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔دوستوں کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔دل آزاری کا ڈھنگ ہی انھیں نہیں آتا۔کسی کو دُکھ دینا ان کی سرشت ہی میں نہیں۔وہ صاف گو اور صاف دل ہیں۔ان کا ظاہر باطن ایک سا ہے۔کسی سے کوئی بغض یا عناد رکھنا ان کی فطرت میں داخل ہی نہیں، ہر بات مُنہ پر کہتے ہیں اور خلوص سے کہتے ہیں۔دل میں کبھی میل نہیں رکھتے اور دل

میں میل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں۔شراب نے ان کو واقعی انسان بنا دیا ہے۔اُن کے کردار کی اِنھی خوبیوں نے اُن کے فن میں بھی خلوص وصداقت اور سچائی کے عناصر پیدا کیے ہیں۔اُن کا مشاہدہ اور تجربہ خواہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہو نہایت سادہ، صحت منداور صحیح ہوتا ہے۔تجربے اور مشاہدے کی یہ سادگی اور صحت شعور ولاشعور کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے اور جب وہ اِن تجربات ومشاہدات کوشعر کی صورت دیتے ہیں تو وہ تمام سادگی، صحت اور خلوص شعر کے لازمی جزو بن جاتے ہیں اور اِس طرح شعر کوصداقت پر مبنی اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔اُن کا فن نکھرا نکھرا ہے۔ ہلکے پھلکے مضامین ہیں جن میں کوئی اُلجھن نہیں، جن میں ہلکے ہلکے اشارے اور کنایے مفہوم کو لطیف بناتے ہیں۔اُن کی شاعری کا حُسن کاری گری اور شعوری کاوش کی بجائے سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کے باعث ہے۔کسی خاص نظریاتی فکر کا فقدان اُن کے ذہن کو محدود دائروں میں گھومنے سے باز رکھتا ہے۔وہ زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں اُسی طرح اِس کا اظہار کرتے ہیں۔اُن کے اشعار ہلکے پھلکے، تصنّع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ رِندی، اس کے اثرات اور اس کے ردِّعمل کے متعلق اُنھوں نے متنوّع قسم کے شعر کہے ہیں جن میں روایتی رنگ کی بجائے ایک انفرادی رنگ کی جھلک موجود ہے۔رِندی کے متعلق چند شعر سُنیئے:۔

پیتا ہوں حادثات کے عرفان کے لیے — مَے ایک تجزیہ ہے غمِ روزگار کا
زمانے کی رفتار سے تنگ آ کر — عدؔم کر لیا مَے کدے میں بسیرا
مَے سی حسین چیز ہو اور واقعی حرام — میں کثرتِ شکوک سے گھبرا کے پی گیا
سو بار لغزشوں کی قسم کھا کے چھوڑ دی — سو بار چھوڑنے کی قسم کھا کے پی گیا
بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام — تصدیق کر رہا ہوں غمِ روزگار سے

عدؔم کی شاعری، شراب، حُسن اور عشق کی شاعری ہے۔اِس میں اگرچہ کوئی سنجیدہ اور واضح فلسفہ یا اندازِ فکر نہیں مگر اِس کے باوجود اُن کی تمام شاعری میں ایک نیم فلسفیانہ ہلکی پھلکی لہر رواں ہے جس میں کبھی کبھار موجیں بھی اُٹھتی ہیں۔اُن کے ہاں تصوّف کی ہلکی پھلکی سی چاشنی بھی ملتی ہے۔

تصوّف کا باقاعدہ رجحان تو نہیں مگر ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ چند شعر سُنیئے: ۔

چُھپے ہو حجاباتِ دَیر و حرم میں مگر بے تکلّف نظر آ رہے ہو
بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم بُرے یا بھلے سب زمانے ترے
ضمیرِ صدف میں کِرن کا مقام انوکھے انوکھے ترانے ترے
جب بھی ہوتے ہیں ہم عدؔم تنہا یار سے ہم کنار ہوتے ہیں
خبر نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے سُنا تو ہے وہ رگِ جاں کے پاس ہوتے ہیں
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا

آج کے شاعروں نے جہاں کئی شعری لوازم کو نظر انداز کر دیا ہے وہاں نغمگی کو بھی شعر کی بنیادی خصوصیت ہے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ عدؔم کے ہاں نغمگی اور روانی مستقل طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مترنّم فضا رچی ہوئی ہے۔ حسین گاتے ہوئے الفاظ اور دلکش ترکیبیں ہی ان کی شاعری کا تار و پود ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور شرارت کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ مثلاً: ۔

بے خودی میں مِری آغوش ہے مجھ سے آگے شرم مت کیجیے میں شاملِ آغوش نہیں
تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم پر ہنستا تو ہو گا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

عدؔم صاحب میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ وہ شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور اُنھیں اِس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کون سا شعر اِس قابل ہے کہ رکھا جائے اور کون سا تلف کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے مگر اِس کے باوجود شعراء میں اکثر اِس قدر تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے کہ وہ کون سے اشعار کو رکھیں اور کن کو تلف کر دیں۔ اُردو کے سب سے بڑے شاعر غالبؔ کے اِسی تنقیدی شعور نے غالبؔ کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔

عدؔم صاحب شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور بعض اوقات رطب و یابس کو بھی چھپوانے سے گریز نہیں کرتے۔ عدؔم صاحب کی زُود گوئی اور کثرت گوئی سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ۱۹۴۷ء ہی کی بات ہے۔ ایک رات وہ زیادہ نشے میں تھے اِس لیے میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب آدھی

رات کا وقت ہوگا کہ یونہی میری آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ بتی جل رہی ہے۔ عدؔم صاحب چار پائی پر بیٹھے ہیں ایک ہاتھ میں سگرٹ دوسرے میں پنسل لیے کچھ سوچ رہے ہیں۔ نوٹ بک سامنے تکیے پر پڑی ہے۔ خیر میں سو گیا۔ میں نے پوچھا۔ مولانا رات کیا بات تھی۔ کہنے لگے: ''حضور! یونہی نیند کھل گئی خیال آیا کہ کچھ شعر ہی کہہ ڈالوں مگر فقط سات غزلیں کہہ کر ہی نیند آ گئی۔'' اب جو شاعر دو گھنٹے میں سات غزلیں کہہ ڈالے اندازہ کیجیے کہ وہ کس کثر سے شعر کہتا ہوگا۔ کثرت سے شعر کہنا بُرا نہیں مگر ان سب اشعار کو مِن وعَن رکھ لینا یقیناً بُرا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شعر اچھا ہوا یا بُرا ہوا بس ہو گیا۔ اب اس میں مزید غور و فکر کرنا اُن کا اصول ہی نہیں۔ اِسی وجہ سے بعض اوقات غزلوں میں بہت ہلکے شعر بھی ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ شعر غزل میں نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے میں نے کئی بار کہا کہ فلاں غزل میں سے فلاں فلاں شعر نکال دیجیے۔ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ ہاں ضرور حذف کر دوں گا۔ مگر جب غزل چھپی تو وہ اشعار موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اُنھوں نے آج تک جتنے شعر کہے ہیں وہ اُنھیں قریب قریب سب کے سب زبانی یاد ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ حافظہ اُن کا بلا کا ہے۔ اشعار کہنے کے بعد اُن کو یاد ہو جاتے ہیں اِس لیے بعد میں اگر وہ چاہیں بھی تو ان اشعار کو حذف نہیں کر سکتے۔ حافظے سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ اتوار کا دن تھا، مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ عدؔم صاحب صبح ہی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد سیف صاحب بھی آ گئے۔ عدؔم صاحب کہنے لگے: ''حضور! آج پیسوں کا کوئی بند و بست ہوتا نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے آج ایک مجموعہ ہی ترتیب دے ڈالوں اور چوہدری نذیر کو دے کر پیسے حاصل کروں۔'' میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے: ''حضور! مجھے اپنے کوئی دو سو قطعات یاد ہیں اُن کو نقل کرنے کی ضرورت ہے۔'' چنانچہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور دوپہر کے کھانے کے دو گھنٹے بعد تک پورے دو سو قطعات حافظے سے نکال کر کاغذوں پر بکھیرے۔ مجموعے کا نام ''ہوائے برشگال'' رکھا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے: ''حضور! چوہدری نذیر کے پاس چلتے ہیں تاکہ آج کی شام کا بندوبست ہو۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدؔم صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے

ان کی شخصیت اور اُن کے فن کو پرکھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ پیشہ ور نقاد حضرات کو میری کئی باتوں سے اختلاف ہو۔ میں سمجھتا ہوں اُنھیں مجھ سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے عدمؔ کو جس طرح دیکھا ہے، جس طرح اُن کی زندگی اور اُن کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اُس کی ایک سیدھی سادی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اگر اِس تصویر میں عدمؔ صاحب کے کچھ خدوخال آپ کو نظر آئیں تو میں سمجھوں گا کہ میں نے یہ چند سطریں بے مصرف نہیں لکھیں۔

حافظ لُدھیانوی

سیّد عبدالحمید عدمؔ

سیّد عبدالحمید عدمؔ لدھیانے کے ایک مشاعرے میں سُنا۔ اس مشاعرے میں ہندوستا کے ممتاز شعراء شریک تھے۔ یہ مشاعرہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں منعقد ہوا۔ یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے اُن دِنوں میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ کا طالب علم تھا۔ کالج کی بزمِ ادب کا سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے مشاعرے کا سارا انتظام میرے سپرد تھا۔ شعراء کو مدعو کرنے کی غرض سے سے لاہور آیا۔ ممتاز شعراء سے یہ میرا پہلا تعارف تھا، حفیظؔ ہوشیار پوری، عابد علی عابدؔ، صوفی تبسمؔ، یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ، ناصرؔ کاظمی، عبدالمجید بھٹی، حمید نسیمؔ مضطرؔ اکبر آبادی اور دوسرے شعراء سے تعارف ہُوا۔ اسی سلسلے میں عدمؔ سے بھی ملاقات ہوئی۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ میں عدمؔ بہت مقبول ہُوا۔ عدمؔ کی شباب ونغمہ کی شاعری نے نوجوانوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

۱۹۴۱ء میں مجھے عدمؔ کے ساتھ کلرک کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ عدم سینئر کلاس ون آفیسر تھا۔ اکاؤنٹ کے محکمے میں مسلمان آفیسر خال خال نظر آتے تھے۔ اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود عدمؔ پر اس افسری کا سایہ تک نہ پڑا تھا۔ دفتر سے نکل کر وہ عدمؔ تھا۔ خُمریات کا عدمؔ، شباب ونغمہ کا عدمؔ، سرمستی و کیف کا عدمؔ.................. دفتر کے بعد وہ کبھی گھر کا رُخ نہ کرتا۔ وہ اپنے کسی دوست، کسی معتقد، کسی ہم مشرب کے گھر پہنچ جاتا اور ''محفلِ شب'' کا پروگرام مرتّب کرتا۔ اُس کے دوستوں اور مدّاحوں میں اکثر اس کے ہم مشرب، ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ عدم کے لیے زندگی سرمستی و سرخوشی کی ایک لہر تھی، ایک مسلسل موجِ نغمہ تھی، ایک مسلسل آہنگِ شعر تھی۔ عدمؔ حال کا شاعر تھا، حال کا انسان، حال کا نغمہ گر.............. عدمؔ نے زندگی کے تمام تفکّرات، تمام پریشانیوں کو، تمام اُلجھنوں کو غرقِ مے ناب کر رکھا تھا۔

عدؔم کے قرب کی وجہ سے مجھے اُس کے حالات، اُس کے معمولات، اُسی افتادِ طبع کو دیکھنے، اُس کی عادات کا مطالعہ کرنے کے بے شمار مواقع میسّر آئے۔ عدم نے گھریلو زندگی کا بہت کم بوجھ اپنے کندھوں پر ڈالا تھا۔ عدؔم کی رفیقۂ حیات سلیقہ مند سمجھدار اور ذمّہ دار خاتون تھی۔ عدؔم کے لا اُبالی پن اور غیر ذمہ دار زندگی کے باوصف اُس نے بچوں کی عمدہ تربیت کی۔ اُنھیں اعلیٰ تعلیم دِلوائی۔

ہمارے دفتر میں ایک ہندو آفیسر چوپڑا صاحب تھے وہ کٹّر اور متعصّب ہندو نہ تھے۔ اُنھوں نے عدؔم کی بے شمار غلطیوں، کوتاہیوں پر دہ ڈالا۔ عدؔم مشاعرے میں شرکت کے لیے ایک دو روز کی چھٹی لے کر لاہور سے باہر جاتا مگر دو دو ہفتے دفتر سے غیر حاضر رہتا۔ دفتر سے اتنے روز کی غیر حاضری انتہائی بے قاعدگی اور قابلِ موٴاخذہ حرکت تھی۔ واپس آکر عدؔم بہانے تراشتا، بے شمار عذر کرتا، بیماری کا ذکر کرتا، کبھی کبھی اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیتا اور چوپڑا صاحب سے معافی مانگتا اور آئندہ غیر حاضر نہ رہنے کا اِس انداز سے یقین دلاتا کہ چوپڑا صاحب کو ترس آجاتا، مگر چند روز کے بعد وہی حرکت کرتا۔ بے قاعدگی اُس کی زندگی کا معمول بن چکی تھی۔

عدؔم کے بارے میں بہت کم علم ہوگا کہ وہ زندگی میں جتنا خود فراموش تھا دفتری زندگی میں اُتنا ہی باہوش اور حاضر دماغ تھا۔ میں نے کئی افسروں کے ماتحت کام کیا۔ کئی ذہین ماتحتوں سے کام بھی لیا۔ مگر میں نے عدؔم جیسا طبّاع، ذہین، ذی علم افسر نہیں دیکھا۔ عدؔم اِتنی خوب صورت انگریزی لکھتا تھا کہ پڑھنے والے اُس کی علمی استعداد، اُس کی قابلیت، اُس کی اپنے کام میں مہارت اور اندازِ تحریر کے معترف ہو جاتے تھے۔ اُس کی تحریروں میں روانی، موضوع پر اختصار و جامعیت اعجاز کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ دو ہفتے کی غیر حاضری کے بعد اُس کی میز پر فائلوں کا ڈھیر لگ جاتا مگر میں نے عدم کو کام کی زیادتی کی وجہ سے پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ اُس کو اپنی ذہانت اور کام میں مہارت پر اعتماد تھا۔ وہ رات گئے تک فائلیں نکالنے میں مصروف رہتا۔ دو تین دِنوں کے بعد اُس کی میز پر کوئی فائل نہ ہوتی۔ دفتر میں وہ اِس انہماک سے کام کرتا جیسے شعر تخلیق کر رہا ہو۔ اُس کی تحریر واقعی تخلیق کا شہ پارہ تھی۔

بات چوپڑہ صاحب کی ہو رہی تھی۔ چوپڑہ صاحب ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو آدھی تنخواہ عدؔم

کے گھر بھجوا دیتے آدھی رقم عدؔم کے حوالے کر دیتے۔ اُس زمانے کے لحاظ سے یہ معقول رقم تھی۔ عدؔم ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شاہ خرچ ہوتا۔ دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا۔ اُسے آنے والے کل کی پروانہ تھی، ہر حال میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ پہلی تاریخ سے شراب کے دَور چلنا شروع ہو جاتے، راتیں شراب خانے کی نذر ہو جاتیں۔ احباب کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ عدؔم کے ہم مشرب اُن دِنوں عدؔم کا سایہ بنے رہتے۔ چار پانچ روز اِنھی ہنگاموں میں گزر جاتے، پانچ چھ روز بعد اُس کی جیب خالی ہوتی۔ سگریٹ نوشی تک کے لیے اُس کے پاس کچھ نہ ہوتا۔ وہ شراب نوشی کی لت پوری کرنے کے لیے احباب کے دروازوں پر دستک دیتا۔ اِس عادتِ قبیح کو پورا کرنے کے لیے اُسے ذلیل ہونا پڑتا۔ رفتہ رفتہ احباب اُس سے دور رہنے لگے۔ مگر وہ اپنی شاعرانہ عظمت کے باوجود، اپنی افسرانہ حیثیت کے باوصف پھر اُنھی دروازوں پر دستک دیتا۔ شراب نوشی نے اُس کے بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار نہ آنے دیا ورنہ عدؔم اُردو ادب کا بہترین محقّق ہوتا وہ ادب میں ایسے ایسے ناقابلِ فراموش کام کر جاتا کہ آنے والے محقّق اُن کی رہنمائی میں اپنی منزل متعیّن کر سکتے۔ وہ جب شاعری اور ادب پر بات کرتا تو اُس کا مخصوص زاویۂ نگاہ ہوتا۔ وہ عام نقّادوں سے ہٹ کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا۔ وہ اُس دور کے ادب کا بہترین نمائندہ تھا .... عدؔم اُستادی شاگردی کا قائل نہ تھا۔ مگر نوجوان شاعر اُس سے اکتسابِ ہُنر کرتے، وہ اُنھیں قیمتی مشورے دیتا بعض شعراء کو تو اُس نے کئی کئی غزلیں لکھ کر دی تھیں۔ اُس میں بے شمار جوہر تھے۔ اُس کو اپنی ذہانت پر ناز بھی تھا۔ شراب نوشی کی عادت نے خدا جانے اُس کے کتنے گُہر ہائے آبدار کو بے آب کر دیا۔

شراب نوشی کے سلسلے میں عدؔم سے ہزاروں داستانیں وابستہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں .... عدؔم نے ایک شب اُس دَور کے ممتاز شعراء کو شراب پلائی۔ یہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ رات بھر جشن رہا، شاعری کے دَور چلے۔ جب سب شراب کے نشے میں مدہوش ہو گئے تو اُس کے شاعر دوست اُس کی جیب سے ساری رقم نکال کر فرار ہو گئے۔ جب عدؔم کو ہوش آیا تو اُس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ دوسرے روز عدؔم نے دفتر آ کر ماجرائے شب بیان کیا، بڑی سادگی سے

ہنستے ہوئے کہا کہ حافظ دیکھو کیسا زمانہ آ گیا ہے، میں نے دوستوں کی خاطر مدارت کی مگر وہ میری جیب پر ہاتھ صاف کر کے چلے گئے، پھر عدؔم نے اس واقعہ کے متعلق تازہ شعر سُنایا: ؎

میں نے شراب، تُو نے مروّت کا خوں پیا
میرا قصور نرم ہے تیرے قصور سے

عدؔم کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ وہ کسی چیز کو سرسری نگاہ سے دیکھ کر اُسے شعری حُسن عطا کر دیتا تھا۔ شعر اُس کی زبان بن چکا تھا۔ اُس نے شعر گوئی میں بے پناہ ریاضت کی تھی۔ اُس کی تصانیف سے اُس کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ عدؔم کو فارسی زبان پر بھی عبور تھا۔ اگر وہ فارسی زبان میں شعر کہتا تو پاک و ہند کے فارسی شعراء میں ایک اور خوب صورت اضافہ ہو جاتا۔

عدم کو خداوندِ کریم نے شعر فہمی کا جو جوہر ودیعت کیا تھا وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ شعر سُنتے ہیں اُس کے تہہ در تہہ معانی، اُس کے ظاہری محاسن اور اُس کی فنّی خوب صورتی کو دیکھ لیتا تھا۔ اچّھے اور خوب صورت شعر پر وہ کھل کر داد دیتا تھا۔ ممتاز شعراء کی طرح اُس نے داد دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ خوب صورت شعر تو اُس کی زندگی کا حصّہ تھا اُس کی رُوح کی غذا، اُس کے وجدان کا اُجالا تھا۔ مبتدی شعراء کا بھی اگر اُسے کوئی شعر پسند آ جاتا تو وہ اِس انداز سے داد دیتا جیسے اُسے خزانہ مل گیا ہو۔ ایک روز عدؔم کو میں نے اپنا تازہ شعر سُنایا، عدؔم سراپا داد بن گیا۔ بار بار شعر پڑھوایا۔ شعر یہ تھا: ؎

جانے کِس غم کدے کے پاس رہی
زندگی رات بھر اُداس رہی

اِس شعر کا کئی روز تک تذکرہ کرتا رہا۔ اچھّا شعر وہ دوستوں کو سُناتا، غائبانہ تعریف کرتا اور اپنے لطف میں احباب کو شریک کر لیتا۔

الطاف مشہدی، حفیظ رومانی، بشیر احمد، مضطؔر اکبر آبادی دل محمد روڈ پر مقیم تھے۔ حفیظ رومانی نے ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مضطؔر اکبر آبادی کو شعر کی پرکھ تھی۔ خود بھی عمدہ شعر کہتا تھا۔ اسی کمرے میں رات کی مجلس جمتی۔ مضطؔر اکبر آباد ترنّم سے شعر سُناتا۔ اُس کا ترنّم عجیب سماں پیدا کر دیتا۔ بسا اوقات

ہم نصف شب کو سیر کے لیے نکلتے، مال روڈ پر گھومتے، شعر کہتے۔ غرضیکہ شب و روز شاعرانہ ماحول میں بسر ہوتے۔

ایک روز عدمؔ مجھے شمس العلماء تاجور نجیب آبادی کے دولت کدے پر لے گیا۔ مولانا بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے، اُس دور کی ادبی انجمنوں کے رُوحِ رواں تھے۔ ایس پی ایس کے ہال میں متعدّد ایسے مشاعروں میں شرکت کی جن کی صدارت علاّمہ تاجور نجیب آبادی نے کی۔ اُن کی ادیبانہ گفتگو بہت پُر لطف ہوتی تھی۔ کالج کے پروفیسر تھے۔ اُن کی غزل میں اُن کا مخصوص رنگ ہوتا تھا۔ اُنھوں نے شاعری کی طرف پوری توجّہ نہ دی۔ چند غزلیں اُن سے یادگار ہیں مگر اُردو زبان کی بہت خدمت کی جس کے صِلے میں اُنھیں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ عدمؔ اور اخترؔ شیرانی نے اُنھیں ابتدائی غزلیں دِکھائیں۔ کچھ عرصہ اُن سے اِصلاح بھی لی مگر جلدی فارغ ہو گئے۔ علاّمہ تاجور صاحب سے عدمؔ نے بحیثیت شاعر میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں بزرگ ادیبوں اور شاعروں کا عجیب تصوّر تھا۔ میں اُنھیں مافوق الفطرت انسان سمجھتا تھا۔ اُن کے ادبی کارنامے، اُن کی تحریریں، اُن کا کلام پڑھ کر اُن کے علم و فضل کا ایک عجیب خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ادب کے اِتنے بلند و بالا مینار ہیں جن تک میرے جیسے مبتدی شاعر کی رسائی ممکن نہیں۔ علاّمہ نے از راہِ شفقت شعر کی فرمائش کر دی۔ کسی بزرگ شاعر کو شعر سُنانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ بہر کیف غزل سُنائی مگر پسینے چھوٹ گئے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا شدّت سے احساس تھا۔ چند غزلیں میرا شعری سرمایہ تھیں۔ علاّمہ صاحب نے غزل پسند فرمائی۔ اُن دِنوں علاّمہ ایک ادبی رسالہ ''شاہکار'' کے مدیر بھی تھے۔ غزل پرچے کے لیے مانگی۔ میں نے اِسے مذاق پر محمول کیا۔ میرے تصوّر میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ایک مبتدی شاعر بھی ایسے بلند پایہ پرچے میں شائع ہو سکتا ہے۔ تعمیلِ ارشاد کر دی .... میری مسرّت امیز حیرت کی انتہا نہ رہی جب اگلے شمارے میں پورے صفحے پر غزل دیکھی۔ یہ واقعہ ضِمناً یاد آ گیا۔ مقصود یہ بتانا تھا کہ عدمؔ کے دروازے سے شہرِ ادب میں داخل ہوا۔ اُن دِنوں مسلماں ادباء اور شعراء کے علاوہ لاہور میں ہری چند اخترؔ، کیفؔ عرفانی، مخمورؔ جالندھری، فکرؔ تونسوی، گوپال مِتّلؔ، دیوندر ستیارتھی، رام

پال، کرشن چندر اور دوسرے ہندو ادیب اور شعراء موجود تھے۔

''خرابات'' غالباً عدؔم کا دوسرا مجموعہ تھا۔ یہ بہت خوب صورت انتخاب تھا۔ اِس میں عدؔم اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ ہر غزل میں عدم کا اپنا منفرد اسلوب، اپنا رنگ جھلکتا ہے۔ ادبی دُنیا میں اِس شعری مجموعے کی خوب پذیرائی ہوئی۔

''خرابات'' کے بعد عدؔم کے متعدّد مجموعے شائع ہوئے۔ شعر گوئی اُس کے لیے مشکل نہ تھی، وہ اپنی ''ضرورتِ شب'' پوری کرنے کے لیے اونے پونے اپنے مجموعے فروخت کرنے لگا۔ ان دواوین میں عدؔم کی چھاپ تو ضرور تھی مگر فکر کی وہ بلندی، افکار کی جِدّت کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ عدؔم کا اپنا وضع کردہ اسلوب تھا، عدؔم کا نام پڑھے بغیر اُس کے کلام کا پتہ چل سکتا تھا۔ یہ انفرادیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اس کے لیے الگ راستہ تراشنا پڑتا ہے۔ اپنا رنگ قائم کرنا پڑتا ہے۔ خاص اسلوب کو اپنانا پڑتا ہے۔ عدؔم کے کلام میں یہ تمام جوہر موجود ہیں۔

عدؔم کی بے راہ روی، غیر ذِمّہ داری کے بہت سے قصے ذہن میں محفوظ ہیں جن کے ذکر سے قاری کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہ اُس کی ذات کا حِصّہ تھے۔ ان کو اُس کی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ ہر انسان کی زندگی کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں، مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ہر اِنسان اچھائیوں اور بُرائیوں کا مجموعہ ہے۔ اچھّائی پھیل کر خوشبو بن جاتی ہے جس سے ہر اِنسان حظ اُٹھاتا ہے۔ بُرائی گھناؤنے اثرات چھوڑ جاتی ہے جس سے معاشرہ بھیانک صورت اِختیار کر لیتا ہے۔ کوئی اِنسان غلطیوں سے مبرّا نہیں۔ ہمیں حسین پہلو کو دیکھنا چاہیے تاکہ قلب ونظر شاداب ہو سکیں۔

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے، عدؔم کو اپنے بلند پایا شاعر ہونے کا کبھی خیال نہ آیا۔ اُس کی شہرت جہانِ اُردو کے آخری کنارے تک پہنچ چکی تھی، وہ ہر مشاعرے کی جان تھا۔ نوجوان اُس کے شباب آفریں شاعری، سرمستی اور والہانہ پن کے دلدادہ تھے۔ کسی مشاعرے یا کسی ادبی محفل میں عدؔم نے اپنے عظیم المرتبت شاعر ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ مرنجاں مرنج انسان تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتا۔ مشاعروں میں اُس نے منتظمینِ مشاعرہ سے کسی خاص منصب کے لیے اِصرار نہیں کیا۔ اُس کو

مشاعرے میں جہاں چاہو پڑھالو یہ اُس کی عالی ظرفی، سادہ طبیعت اور منکسرالمزاجی کی دلیل تھی۔ بارہا دیکھا گیا کہ اگر کسی شاعر کو اُس کے مرتبے اور مقام کا خیال نہ رکھتے ہوئے پہلے دعوتِ کلام دی گئی تو وہ برہم ہوگیا۔ بعض اوقات یہ برہمی تعلّقات کے مُنقطع ہونے کا سبب بنی مگر عدؔم نے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچ کر منتظمین مشاعرہ کو کسی موقعے پر یہ احساس نہیں ہونے دیا .... کئی بار ایسا ہُوا کہ مشاعرے کی بگڑی ہوئی فضا کے پیشِ نظر عدؔم کو آغازِ مشاعرہ ہی میں دعوتِ سُخن دی گئی۔ عدؔم بغیر تأمّل کے مائیک پر پہنچ گیا۔ ایک غزل چند قطعات سُنائے مشاعرے کی فضا درست ہوگئی۔ ماحول یکسر بدل گیا۔ عدؔم تالیوں کی گونج میں خاموشی سے اپنی جگہ آ بیٹھا۔ عدؔم کے شعر پڑھنے کا انداز گفتگو جیسا تھا۔ شعر پڑھنے میں عدؔم نے کبھی تکلّف سے کام نہیں لیا جیسے دوستوں کی محفل مین شعر پڑھتا تھا ویسے ہی سٹیج پر شعر پڑھتا تھا۔ اُس کی شاعری، اُس کی زندگی، اُس کی گفتگو میں تکلّف کا شائبہ تک نہ تھا۔ اُس کو تصنّع اور بناوٹ سے نفرت تھی اِس لیے اُس کے جسم پر کوئی خول نہ تھا۔

لغزشوں خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود احباب سے انتہائی خلوص کا برتاؤ کرتا، دوستوں سے اخلاص اُس کی زندگی کا نصب العین تھا۔ دوست ہی اُس کا قیمتی سرمایہ تھے جس پر اُس کو ناز تھا۔ عدؔم نے جس سے دوستانہ مراسم اُستوار کیے اُنھیں عمر بھر نبھایا۔ اُس کے حلقۂ احباب میں صرف شاعر حضرات ہی نہ تھے بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلّق رکھنے والے اُس کے دوست تھے۔ ان احباب کی فہرست بہت طویل تھی۔ اُن میں افسر بھی تھے، کاروباری لوگ بھی، کالج کے اساتذہ بھی تھے اور طالبِ علم بھی، شاعر بھی تھے اور دُکان دار بھی۔ معمولی حیثیت کے لوگ بھی تھے اور رؤسا بھی۔ عدؔم کا برتاؤ ہر ایک سے پُرخلوص تھا، وہ سب کو ایک ہی انداز میں ملتا۔

عدؔم مختلف شہروں میں میرے غریب خانے پر ٹھہرا۔ جب کسی مشاعرے کے سلسلے میں کسی شہر اُس کا آنا ہُوا تو منتظمین کے اصرار کے باوجود وہ میرے ہاں ٹھہرا حالانکہ اُس کے مدّاحوں کی تعداد کم نہ تھی۔ اہلِ مشاعرہ اُس کے مزاج، اُس کی اُفتادِ طبع کے مطابق اُس کی رہائش اور خورد ونوش کا اعلیٰ انتظام کرتے مگر وہ کہیں نہ ٹھہرتا۔ یہ اُس کی دوستی، وضع داری اور خلوص کی دلیل بھی۔ عدؔم کو میرے گھر میں

شراب نہ ملتی اِس لیے وہ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتا مگر رفاقتِ دیرینہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مجھے ہی اعزاز بخشتا اور میرے گھر ہی قیام کرتا۔

بسا اوقات شاعر کے کلام اُس کی روز مرّہ زندگی اُس کے اعمال و کردار، اُس کی بُو دو باش، اُس کے افکار و نظریات میں تضاد نظر آتا ہے۔اس پر غالب کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

شاعر یا ادیب سے ملاقات کے بعد اُس کی عظمتوں کے قلعے مسمار ہو جاتے ہیں اس کے بلند مینار زمیں بوس ہو جاتے ہیں، وہ خوب صورت ہیولیٰ جو قاری اپنے ذہن میں بناتا ہے قائم نہیں رہتا۔ادبی رسالوں کے اوراق پر اُس کے افکار جو خوب صورت تصویریں بناتے ہیں، لطافتِ فکر کی جو خوشبو بکھیرتے ہیں، انسانیت کے اعلیٰ اقدار کا جو درس دیتے ہیں اُس کی زندگی ان اوصاف سے یکسر عاری ہوتی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ دو الگ الگ پیکر ہیں۔شعر تخلیق کرتے وقت فکر کی بلندیوں پر پہنچ کر وہ کوئی دوسرا پیکر ہوتا ہے جو شعری تخلیق اور ادبی تحریر کے بعد غائب ہو جاتا ہے.................مگر عدؔم کی زندگی اور اُس کے کلام کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا۔اُس نے کبھی کوئی نقاب نہیں اوڑھا، اُس کے جسم پر منافقت اور ریاکاری کا کوئی خول نہ تھا۔وہ جیسا نظر آتا تھا خلوت اور جلوت میں بالکل ویسا ہی تھا۔اُس نے زندگی بھر اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔اگر عدؔم نے اپنی شاعری میں شراب کا ذکر کیا ہے تو یہ اُس کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ تھی۔اگرچہ اُس کو اِس عادتِ بد کا کئی بار خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔کئی ناخوشگوار واقعات رُونما ہوئے۔ذلّت و خواری ہوئی۔اگر عدؔم نے اپنی شاعری میں خلوص کا ذکر کیا ہے تو اُس کا کردار اِس لفظ کی آبرو تھا۔عدؔم دوستوں کے لیے سراپا ایثار تھا۔عدؔم ہی کا شعر ہے:

اے عدؔم سب گناہ کر لیکن
دوستوں سے ریا کی بات نہ کر

وہ دوستوں سے فریب کاری کو گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔وہ کِسی مرحلے، کِسی موقع، کِسی منزل پر دوستوں سے بے وفائی اور بے مروّتی کا مُرتکب نہیں ہُوا۔اِس سلسلے میں عدؔم کا ایک نہایت خوب

صورت اور دلکش شعر ہے:۔

عدؔم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

پُرخلوص لوگوں کو کس حسین پیرائے میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، یہ انداز عدؔم سے مختص تھا۔

دوستوں کے سلسے میں اُس کا قلب صاف شفّاف آئینے کی طرح تھا۔ اگر عدؔم کو گمان بھی گزرتا کہ اُس کا فلاں دوست اُس سے ناراض ہے تو وہ بلا تکلّف معافی مانگتا۔ وہ جب نشے میں ہوتا تو اکثر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا کرتا تھا کہ حضور میں آپ کا غلام ہوں۔ نشے میں اُس کے اندر کا خلوص چہرے پر پھیل جاتا تھا۔

عدؔم خمریات کا شاعر تھا۔ اُردو اَدَب میں ریاضؔ خیر آبادی کے بعد شاید ہی دُوسرا کوئی ایسا شاعر ہو جس نے خُمریات پر اِتنا لکّھا۔ عدؔم اور ریاضؔ خیر آبادی میں موضوع کی مماثلت کے علاوہ بے ساختگی اور بے تکلّف شاعری کا عنصر بھی مشترک ہے۔ عدؔم شاعری میں باتیں کرتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ نہ شعر میں تکلّف نہ لہجے میں نہ زندگی میں .... اُردو اَدَب میں سہلِ ممتنع کی ایسی بہت کم مثالیں نظر آئیں گی۔ داغؔ نے سہلِ ممتنع کی داغ بیل ڈالی۔ ریاضؔ اور عدؔم نے نے اسے نیا آہنگ دیا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو عدؔم نے اِس سادگی، اِس پُرکاری اور سلاست سے بیان کیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ شعری ذوق رکھنے والے حضرات اِس اسلوب، اِس طرزِ نگارش کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اِس ضمن میں عدؔم کے کلام سے بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں:۔

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں — آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
وہ پرندے کہ آنکھ رکھتے ہیں — سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں
رات کس شغل میں گزاری ہے — آپ کی آنکھ بھاری بھاری ہے
اِک حسیں آنکھ کے اِشارے پر — قافلے راہ بھول جاتے ہیں
زندگی کے اُداس لمحوں میں — بے وفا دوست یاد آتے ہیں

شعر پر خوب صورت نثر کا گمان ہوتا ہے اِس سادگی، بے تکلّفی اور بے ساختگی سے شعر کہنا انتہائی مشکل ہے۔ قادرالکلام شاعر ہی شعر میں ایسے موتی جڑ سکتا ہے۔ عدؔم چھوٹی اور طویل بحروں میں یکساں طور پر بے تکلّف شعر کہتا تھا۔ اُس کے فکر کی روانی اور جودتِ طبع میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

مجھے بھی ضد ہے، تجھے بھی ضد ہے، ضدوں کی یہ دھوم کم نہ ہوگی
ترا تبسّم جواں رہے گا ، مِرے اِرادے جواں رہیں گے

☆☆☆☆☆

بھنور بھنور ہے اگر طلاطم تو تیرا دل کیوں دھڑک رہا ہے
یہاں کچھ ایسے بھی ہیں سفینے جو سرکشی سے رواں رہیں گے

☆☆☆☆☆

غمِ زمانہ ستا رہا ہے ، غمِ محبت مسل رہا ہے
مگر مِرے دن گزر رہے ہیں ، مگر مِرا وقت ٹل رہا ہے

☆☆☆☆☆

مِری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دو گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو ، تمام ماحول جل رہا ہے

☆☆☆☆☆

ملے ہیں دل پر نشان دُھندلے سے بارہا تیری اُنگلیوں کے
مِرا تعارف ہوا ہے شاید تِری مُروّت سے غائبانہ

☆☆☆☆☆

اِدھر جو آ ہی گئے ہو صاحب تو ہم فقیروں سے بُخل کیسا
یہاں بھی اِک شب قیام کرلو، دُعائیں دے گا غریب خانہ

شعر کہنا عدؔم کے لیے باتیں کرنا تھا۔ انتہائی بدمستی اور مدہوشی کے عالم میں بھی عدؔم جب شعر کہتا تھا تو فکر کی پختگی، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی اور سلاست کا انداز اُس کے ہم رکاب رہتا تھا۔ شعر پوری آب و تاب، مکمّل لوازمات اور اِنتہائی بلاغت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا تھا۔ عدؔم کا شعر ہے:؂

گماں نہ کر کہ مجھے مَے کشی کی عادت ہے

مِری نگاہ شریکِ حواس رہتی ہے

اس کا دوسرا شعر حُسنِ بیان میں لاثانی ہے جس میں عدؔم کا خاص رنگ جھلکتا ہے۔ ؂

چلی بھی جائے اگر چمن سے بہار کی رُت

تو تیری زُلفِ پریشاں کے پاس رہتی ہے

عدؔم نے شراب کو شعر کا حصہ بنالیا تھا۔ سرمستی اُس کے فکر کو تازیانہ لگاتی تھی۔ بے خودی سے شعر کا شعور اُبھرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خودفراموشی حسین شعر میں ڈھل کر نمودار ہوتی تھی۔ یہ قدرتِ کلام اُسی شاعر کو نصیب ہوتی ہے جس کے فکر کا زاویہ، جس کی سوچ کا انداز، جس کے خیال کی ہر لہر شعر کی صورت اختیار کر لے۔ مسلسل شراب نوشی اور متواتر فکرِ سُخن اُس کے شعور اور تحت الشّعور کا حِصّہ بن گیا تھا۔ ؂

میرے شعروں کا ماجرا مت پوچھ

یہ ندی دو رُخوں سے بہتی ہے

ایک مصرع شعور کہتا ہے

ایک مصرع شراب کہتی ہے

عدؔم کو اِس شعورِ شاعرانہ اور خیال کی آزادہ روی نے کبھی کبھی بہکا بھی دیا تھا۔ وہ تما حدودو قیود سے آزاد ہو کر مذہب کے بارے میں، خداوندِ کریم کے بارے میں، جلیل القدر ہستیوں کے بارے میں گستاخی اور بے باکی کا مُرتکب ہو جاتا تھا۔ زندگی کی چند حدود متعیّن ہیں، معاشرے کے کچھ قوعدو ضوابط ہیں، تہذیب کی کچھ اقدار ہیں، مذہب کے کچھ اصول ہیں۔ اگر انسان اِن تمام پابندیوں کو

پھلانگ کر جو بھی جی میں آئے کہتا چلا جائے تو ایسا کلام قابلِ ملامت ہوگا اور کوئی سلیم فطرت انسان اسے پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ بہر کیف عدؔم کے مذہب کے بارے میں چند اشعار ضرور قابلِ گرفت ہیں۔

یہ سب کچھ اِس لیے تھا کہ عدم کو زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہ تھی، اِس لیے وہ گھریلو ذمّہ داریوں اور اخلاق و آداب کے ضابطوں کی پابندی نہ کر سکا۔ شراب اُس کے لیے مسلّمہ حقائق سے فرار اور گُریز کا ذریعہ تھی۔ وہ مستی میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ وہ زندگی کے تکلیف دِہ حالات سے بچنے اور مصائب و آلامِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ جب بھی کوئی اُفتاد پڑتی تو وہ اس کا علاج شراب نوشی میں ڈھونڈتا اور مے خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتا جہاں اُسے وقتی طور پر چند لمحوں کے لیے ذہنی آسودگی میسّر آتی۔

مے کدہ ہے ، یہاں سکون سے بیٹھ
کوئی آفت اِدھر نہیں آتی

آ اے غمِ دوراں ، درِ میخانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے، ذرا باتیں کریں گے

مَیں مَے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

اِس طرح کے بیسیوں اشعار اُس کے کلام میں ہمیں ملتے ہیں، جہاں وہ نشے میں خود کو گُم کر دینا چاہتا ہے۔

بات عدؔم کی قادرالکلامی کی ہو رہی تھی، اُس کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ جیسا کہ آغازِ مضمون میں تحریر کر چکا ہوں کہ عدؔم انتہائی ذہین طبع شخص تھا۔ اُس نے اپنی تمام صلاحیتیں شعری ادب میں سمو دی تھیں۔ وہ ہر لحظہ، ہر وقت شعر کی تخلیق میں مگن رہتا تھا۔ خوب صورت مضامین کی قطار اُس کے جُنبشِ ابرو کی منتظر رہتی تھی، وہ جب چاہتا اِس خوب صورت جزیرے سے

موتی نکال کر شعر میں جڑ دیتا۔ وہ الفاظ کے مزاج سے آشنا تھا بلکہ الفاظ کا مزاج اُس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصّہ ممتاز شعراء کی محفلوں میں گزرا۔ ملک گیر شہرت کے شاعروں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی مگر میں نے ایسا کوئی شاعر نہیں دیکھا جو اِتنی جلدی اِتنا مکمّل اور اِتنا خوب صورت شعر کہہ سکتا ہو۔ جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے کہ عدؔم شعر میں ہر لفظ کا استعمال انتہائی شعور کے ساتھ کرتا تھا۔ وہ الفاظ کے مزاج، اُس کے آہنگ، اُس کے معانی اور اُس کے حُسن سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ الفاظ کے صحیح اور برجستہ استعمال میں کمال کا درجہ رکھتا تھا اِس لیے اُس کے کلام میں جِدّتِ افکار، مضمون آفرینی اور اِنفرادیت کا عنصر نظر آتا ہے۔ ایک روز میں نے یہ جاننے کے لیے کہ انتخابِ الفاظ میں عدؔم کس قدر محتاط ہے، عدؔم سے اِس شعر کے ایک لفظ کی وضاحت چاہی۔ شعر یہ تھا: ؎

اِک ستارہ ، اِک کلی ، اِک مَے کا قطرہ ، ایک زُلف
جب اکٹھے ہو گئے ، تعمیر جنّت ہو گئی

میں نے عدؔم سے کہا کہ کلی، مَے کا قطرہ اور زُلف کے استعارے تو سمجھ میں آتے ہیں، ستارے سے اِس شعر میں کیا مراد ہے؟ عدم قلعہ گوجر سنگھ کے باہر اِی جگہ بیٹھ گیا اور بلا تأمّل جواب دیا کہ ستارے سے مراد وہ روشنی مراد ہے جس میں تمازت نہیں ہوتی، وہ جنّت میں ہو گی۔ اِس برجستہ جواب پر میں اُس کی لفظ شناسی کا قائل ہو گیا۔

سلاست، بے ساختگی اور روانی کے علاوہ عدؔم کے کلام میں اور بہت سے محاسن ہیں جہاں عدؔم اپنی مثال آپ نظر آتا ہے۔ اُس کی جودتِ طبع اور فکرِ تازہ نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے پرانے مضامین کو نئے انداز میں پیش کر کے اُردو اَدب میں حسین اضافہ کیا۔ عدؔم کے کلام میں ہم کو اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ چند موضوعات پر ابتدائے شاعری طبع آزمائی ہوتی آئی ہے۔ متقدّ مین نے ان مضامین میں اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے جوہر دکھائے مگر روایت کو، نفسِ مضمون کو جوں کا توں رہنے دیا۔ چاکِ دامن کو رفو کرنے کا مضمون بہت پُرانا ہے۔ شُعرائے متقدّ مین کے کلام میں یہ مضمون جابجا نظر آتا ہے۔ مصحفؔی کا شعر ہے: ؎

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہو گا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفُو کا نکلا

چمک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفُو کیا ہے

(غالب)

امیرؔ مینائی نے اِس مضمون کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک خوب صورت شعر میں پیش کیا ہے:ـ

عصمتِ یوسفؑ نے اچھا گُل کھلایا مِصر میں
پاک دامانی سے پیدا چاک دامانی ہوئی

شعراء نے مضمون آفرینی تو کی مگر روایت کو ویسے ہی رہنے دیا، مگر عدمؔ نے روایت سے ہٹ کر اِس موضوع کو اپنے انداز میں پیش کر کے ایک نیا حُسن دیا:ـ

چاکِ دامن مِرا رفُو نہ کرو
یہ کسی دوست کی نشانی ہے

اِسی طرح آئینے کو شعرائے متقدّمین نے نئے انداز سے پیش کرتے رہے۔ محاورے کا برجستہ استعمال کیا۔ اِس سلسلے میں ہمیں فکر انگیزی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے:ـ

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

غالب ہی کا ایک اور شعر ہے:ـ

آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جِسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جِسے

حفیظؔ جالندھری مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر پر سیّد عابد علی عابدؔ مرحوم نے بہت داد دی تھی۔ شعر فہمی میں سیّد عابد علی عابدؔ مرحوم کی پسند سند کا درجہ رکھتی تھی۔

آئینہ دیکھیے ، مِری صورت نہ دیکھیے
میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجیے

میرا ایک شعر ہے:

تفسیر بن گیا ہوں میں اُن کے جمال کی
آئینہ دیکھتے ہیں مجھے دیکھ کر کہاں

فانی بدایونی کا شعر ہے:

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا
مَیں بعُنوانِ دِگر یاد آیا

ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں متقدّمین شعراء کا رنگ جھلکتا ہے:

دل کی بساط کیا ہے نگاہِ جمال میں
اِک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

آئینہ ٹوٹنا، آئینے کا حیران ہونا، آئینہ دِکھانا وغیرہ وغیرہ کے محاورات شعراء نے ہزار انداز سے باندھے ہیں۔ اس موقع پر جگر مرادآبادی مرحوم کا خوب صورت شعر یاد آیا

خدا معلوم کس عالم میں حُسنِ یار دیکھا ہے
وہ عالم ہے کہ آئینے کی حیرانی نہیں جاتی

عدؔم نے اس موضوع کو اپنے انداز میں پیش کیا۔ یہاں بھی اُس کا مُنفرد رنگ نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

برونِ آئینہ وہ خود کھڑے ہیں   دُرونِ آئینہ میں آ گیا ہوں
تازگی ہے تِری جوانی کی   آئینے تو بہت پُرانے ہیں
اِتنی آرائشیں نہ فرماؤ   آئینے کی نگاہ سادہ ہے

یہ تو میں نے ارتجالاً چند اشعار نقل کر دیے ورنہ عدم کے کلام میں نادر تشبیہات، خوب صورت استعارات

اور جدّتِ مضامین کی ایک دُنیا آباد ہے جو اُس کے حُسنِ خیال کی کرشمہ سازی ہے۔ اُس کے کلام کا اگر بالاستعجاب مطالعہ کیا جائے تو جگہ جگہ گلشنِ معانی مہکتا نظر آئے گا۔

عدؔم کے اشعار کی طرح اُس کے قطعات بھی الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان میں بھی اُس کا اپنا انداز، اپنا اسلوب نظر آتا ہے۔ خُمریات کے قطعات ہوں یا دوسرے موضوعات پر قطعات ہوں، عدم کا بے ساختہ لہجہ، اُس کی مُنفرد سوچ، اُس کے ابلاغ کی سادگی بتاتی ہے کہ یہ قطعات عدؔم کے ہیں۔ قطعات اور رُباعی بہت پُرانی اصناف ہیں، اساتذۂ فن نے اپنے اپنے زمانے میں قطعہ اور رُباعی پر اپنی قُدرتِ کلام، فنّی کمال اور نُدرتِ مضامین کے جوہر دِکھائے۔ اساتزہ کے کلام میں کئی کئی اشعار کا قطعہ ملتا ہے۔ ایک خیال کو مسلسل کئی اشعار میں بیان کیا گیا ہے۔ اب دو شعر کا قطعہ کہا جاتا ہے۔ دو شعر میں خیال کو سجا کر بیان کرنا قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ عدؔم نے تو قطعات پر دیوان مرتّب کیا جو مضامین کے تنوّع، فکر کی تازگی، جدتِ مضمون کے لحاظ سے ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ چند قطعات دیکھیے:

شِکَن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے — یہ مسکراتی ہوئی چیز مسکرا کے پلا
سرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف — شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

☆☆☆☆☆

تِری نظر کے اشارے پہ چل رہا ہوں میں — تِرے کرم کے سہارے پہ چل رہا ہوں میں
وہ حادثات ہیں راہِ حیات میں ساقی ! — سڑک سے ہٹ کے کنارے پہ چل رہا ہوں میں

☆☆☆☆☆

نگاہِ ناز سے رنگینیٔ شراب چلی — کہ ناز کرتی ہوئی نخوتِ شباب چلی
مِرے فسانے کا جب آخری ورق اُلٹا — کسی کے سہمے ہوئے ہاتھ سے کتاب چلی

خُلق مانندِ آب ہوتا ہے — طبع مثلِ نسیم ہوتی ہے
ظرف جتنا وسیع ہوتا ہے — بات اُتنی حلیم ہوتی ہے
آپ کیوں اِس اصولِ زرّیں سے — کوششِ اختلاف کرتے ہیں

قاعدہ ہے کہ دوستوں کے قصور دوست ہنس کر معاف کرتے ہیں

☆☆☆☆☆

ٹوٹی قبروں پہ بال بکھرائے جب کوئی مہ جبین (مصحقی روتی) ہے
مجھ کو اکثر خیال آتا ہے موت کتنی حسین ہوتی ہے

ایک اور قطعہ دیکھیے جس میں الفاظ کا برجستہ استعمال اور صوتی آہنگ اپنی مثال آپ ہے۔

تازہ تر نکلا ہے کیا تخلیق کی ترکش سے تیر دیکھنا وہ آ رہی ہے سامنے سے ایک ہیر
مرمریں گردن میں اِک تعویز ہے اِس خوف سے دُدھ کے دھارے پہ لب رکھ دے نہ کوئی راہ گیر

عدؔم شکل و شباہت سے شاعر معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، اُس کی کشادہ پیشانی، اُس کا والہانہ انداز، اُس کی دلکش گفتگو، غرضیکہ اُس کی ہر ایک ادا اُس کے شاعر ہونے کی شہادت تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کی ذہانت کا آئینہ دار تھا۔

عدؔم کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اُس کو اپنے کلام کا بیشتر حصّہ زبانی یاد تھا۔ کسی مشاعرے، کسی ادبی محفل میں عدؔم نے کسی کاپی یا کاغذ سے پڑھ کر کلام نہیں سُنایا۔ وہ جو کچھ لکھتا وہ کم و بیش اُس کے حافظے میں محفوظ رہتا۔

عدؔم کا قیام میاں میر میں تھا۔ راقم الحروف کی رِہائش بھی اُس کے نزدیک تھی اِس لیے رات دِن کا کافی حصّہ عدؔم کے ساتھ گزرتا۔ کوئی ذمہ داری نہ تھی ۔ میں اکیلا ایک عزیز کے ہاں رہتا تھا اور خاندان کے باقی افراد لُدھیانہ میں تھے۔ دفتر کے بعد سائیکلوں پر ہم دونوں میاں میر سے بیڈن روڈ تک آتے ۔ راستے میں کِسی مصرع پر غزل شروع کر دیتے ۔ جب غزل مکمل ہو جاتی تو اُسے سڑک کی روشنی میں نقل کر کے دوسری غزل شروع کر دیتے ۔ بسا اوقات بیڈن روڈ تک آتے آتے دو دو غزلیں ہو جاتیں۔ کثرتِ مطالعہ نے ارتجالاً شعر گوئی کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ شعر کہنا مشکل نہ تھا۔ جب ہم بیڈن روڈ پہنچتے تو احباب تازہ کلام کے منتظر ہوتے ۔ یہ تازہ کلام ہر روز احباب کی ضیافتِ طبع کا سامان بنتا۔ چند دوستوں کی محفل، محفلِ مشاعرہ میں بدل جاتی۔ عدؔم نے میرے کسی شعر پر اِصلاح نہیں دی مگر عدؔم کی

رفاقت، اُس کی شب و روز کی رفاقت، اُس کی شب و روز کی صحبت سے غزل کے رموز و نکات اور شعر کہنے کے اسلوب سے واقفیت ہوگئی۔

عدؔم کے ساتھ گزارے ہوئے بے شمار واقعات ذہن میں محفوظ ہیں۔ ابھی وہ احباب موجود ہیں جو ان واقعات کے شاہد ہیں۔ عدؔم کی زندگی کی ہر شب کوئی نہ کوئی واقعہ لیے ہوئے ہے۔ لاہور کی سرزمین پر اُس کی سرمستی کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ تنہائی میں جب ان گزرے ہوئے دِنوں کی یاد آتی ہے تو طلسماتی فضا کا احساس ہوتا ہے۔.................. زندگی کی منزل میں غم واندوہ کا کوئی نشان نہ تھا۔ شگفتہ وشادت لمحات کے سنگِ میل دِکھائی دیتے تھے۔ اگر ان تمام حالات وواقعات کا تفصیل سے ذکر کروں تو عدؔم کی بوالعجبیاں، عدؔم کی خوب صورت گفتگو، عدؔم کے مزاج کی نرمی، عدؔم کی احباب نوازی، عدؔم کی انسان دوستی، عدؔم کا خلوص، عدؔم کی شاعری کے محرّکات اور عدؔم کے دوسرے بے شمار عنوانات نکھر کر سامنے آجائیں گے مگر اِس مختصر سے مضمون میں اُن کی گنجائش نہیں۔

عدؔم کو شراب گُھن کی طرح کھا چکی تھی۔ اُس کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ ہم نوالہ وہم پیالہ ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ انجمن آرا شخص تنہائی اور عُزلت کا شکار ہوگیا۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب عدم چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ شراب نے اُس کے جسم کی دیوار کو ہی نہیں گرایا اُس کی تخلیقی قوتوں کو بھی متأثر کیا۔ زندگی کے آخری چند سال اُس نے خلوت نشینی میں بسر کیے جس کا کلام ہر ادبی پرچے کے اوراق کی زینت ہوا کرتا تھا۔ اب نگاہیں اُس کا ایک شعر دیکھنے کو ترس گئی تھیں جو اُس کی زندگی کا واحد سہارا تھا وہ بھی اُس سے چِھن گیا۔

آخری بار عدؔم کو ٹیلی ویژن کے انٹرویو میں دیکھا۔ وہ سوال کا جواب دینے سے پہلے کسی گہری سوچ میں کھو جاتا۔ پھر سر اُٹھا کر بمشکل چند جملے کہتا۔ اُس کے قوائے جسمانی جواب دے چکے تھے۔ یادداشت اُس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ ماضی جو اُس کے لیے شگفتہ خواب تھا زندگی کا سراب بن چکا تھا۔ ٹیلی ویژن پر اُسے دیکھ کر اُس کی رفاقت کے خدا جانے کتنے زمانے نظر سے گزر گئے۔ اُس کی معیت کا ایک ایک نقش اُجاگر ہوگیا۔

آخر وہ لمحہ آیا جو ہر ذی روح کا مقدّر رہے۔ وہ البیلا شاعر، وہ سر مستی کا پیکر، وہ نغمۂ شاعری ہم سے جدا ہو گیا جس کی زندگی کا ہر لمحہ شعری تخلیق میں صرف ہوا جس نے زمینِ شعر میں ایسے ایسے گل کھلائے جن سے چمنستانِ شعر و ادب ہمیشہ معطّر و شاداب رہے گا۔ زندگی کی وہ لہر جو عدم کے ساتھ رہی تھی زندگی ہی میں عدم سے جدا ہو گئی اور وہ اپنے تخلّص کی تفسیر بن کر رہ گیا۔ عدؔم منزلِ عدم پر پہنچ گیا مگر اُس کی تخلیقات، اُس کی ادبی کاوش، اُس کا شعری حسن، اُس کا منفرد انداز اُسے مرنے نہ دے گا۔ اُس کے اشعار قاری سے گفتگو کرتے رہیں گے۔ ان اشعار کے پردے سے عدؔم ہمیشہ جھانکتا رہے گا۔

قمر یورش

عبدالحمید عدمؔ

شاعرِ رومان سیّد عبدالحمید عدمؔ سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس سال پہلے میاں یعسوب الحسن مدیر ''خضرِ راہ'' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل میرا اُن سے غائبانہ تعارف تھا۔ میاں یعسوب صاحب نے عدمؔ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ شاعرِ خرابات سیّد عبدالحمید عدمؔ ہیں، یہ میرے میرے بڑے مخلص دوست ہیں۔ عظیم شاعر ہی نہیں، عظیم انسان بھی ہیں۔ پھر میرا اُن سے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ میرا یار قمر یورش افسانہ نگار۔'' پھر میاں یعسوب نے مجھ سے کہا: ''دوستی کے اعتبار سے تم عدمؔ میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔'' پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے: ''بھئی میں تو دوستی پر کچھ زیادہ ایمان نہیں رکھتا کیونکہ زندگی میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں نے زیادہ نقصان اُٹھایا ہے، وہ میرے دوست ہی ہیں مگر عدمؔ کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔''

ہم دونوں بڑی بے تکلّفی سے ایک دوسرے کے سامنے جھکے اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر تجسّس آمیز نظروں اور بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے گلے ملنے کے بعد باتیں کرنے لگے۔

میں نے عدمؔ کی حسین و جمیل غزلیں پڑھ کر اُن کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا جس کے مطابق وہ دھان پان، پستہ قد، گورے چٹّے لکھنوی انداز کے شاعر تھے۔ پھول دار شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے اور مُنہ میں گلوری دبائے، نستعلیق قسم کے جو بات بات پر کہیں گے ''واہ، کیا عمدہ شعر کہا ہے۔'' اب میں اُن سے ملا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، عدم مجھے شاعرِ رومان کی بجائے باڈی بلڈر، گُگّے باز یا ناسخؔ کی طرح پہلوان نظر آ رہے تھے۔ سانولا رنگ، دیو قامت، میں اُنھیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ وہ مجھے ہرگز شاعر نظر نہ آتے تھے۔ میں اُن کی بڑی تعریف سُن چکا تھا کہ وہ بڑے خوب

صورت شاعر اور بے حد دوست نواز ہیں۔ اُن کے پاس روپے پیسے کی بھی کمی نہیں۔ وہ دوستوں پر دونوں ہاتھوں سے دولت لُٹاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں عدم کی شخصیت کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے رُستمِ زماں گاماں پہلوان کے شاگرد نظر آتے تھے۔ اُن کا گول چہرہ بچوں کی طرح معصوم تھا۔ ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ بعد کی ملاقاتوں سے پتہ چلا ہو جتنے بڑے شاعر ہیں اُتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں۔ عدؔم صاحب عجز و اِنکساری کا مجسّمہ تھے۔ بات بات پر ہاتھ جوڑتے۔ اُنھیں اپنی بڑائی کا کوئی غرور نہ تھا۔ اکثر قمیص پاجامے میں دفتر آتے اور کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔ مگر اُن کے سوٹ کا کپڑا ہمیشہ قیمتی اور نایاب ہوتا تھا۔ جب وہ محفلِ رِنداں میں آتے تو دو چار سو روپے جیب میں ڈال کر آتے، خود پیتے، دوستوں کو پلاتے تھے۔ جب پی لیتے تو بلبل ہزار داستان بن جاتے۔ کبھی کبھی اُن کے ساتھی عالمِ سرور میں اُنھیں دیکھتے تو اُن کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ عدؔم کو پتہ چلتا تو وہ رونے لگتے۔ وہ روتے ہوئے بھی بہت معصوم اور خوب صورت دکھائی دیتے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا گم ہو جانے سے روتا ہے۔

جب میں اُداس ہوتا تو جی بہلانے کے لیے عدؔم کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہاں میں طرح طرح کی باتیں سُنتا، علم و ادب کی باتیں، سائنس کی باتیں، نغموں اور گیتوں کی باتیں اور پُر مسرّت زندگی کی باتیں جنھیں سُن کر میری روح میں تازگی آتی اور طبیعت گلاب کے پھول کی طرح کِھل جاتی تھی۔ میں پینے پلانے کے کام میں عدؔم کا ساتھی نہ تھا، میں صرف اُن کے عالمِ سرور و کیف کی گپ شپ سُننے کے لیے اُن کی محفل میں شریک ہوتا تھا۔ وہاں سعادت حسن منٹو کا ایک دوست عزیز عرف جیجا غُنڈہ بھی آتا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے اُس پر ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔ یہ جیجا غنڈہ بڑا خونخوار قسم کا تھا۔

عدؔم کی محفل بھی عجیب تھی۔ یہاں ہر طرز اور ہر وضع کا آدمی بے تکلّفی سے آتا تھا۔ اُن میں اعلیٰ ادنیٰ کوئی نہ تھا، سب سے برابری کا سلوک ہوتا۔ ایک روز میں اُن کی محفل میں گیا تو دیکھا دو خوب صورت اور خوش پوش نوجوان مُرغا بنے ہوئے ہیں اور ظہیر کاشمیری اُن کی جوتوں سے پٹائی کر رہے ہیں اور قریب ہی میاں یعسوب ایک کُرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے سگریٹ پیتے، پیرِ مغاں بنے مسکرا

رہے ہیں۔ میں نے جاتے ہی پوچھا: ''بھئی یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے؟'' میاں یعسوب نے کہا ''یہ قوم کے غدار ہیں۔'' ظہیر کاشمیری کہنے لگے: ''اِن بچھوؤں نے عدم کی جیب صاف کر دی ہے اور پانچ سو روپے نکال لیے ہیں۔''

خیر اُن سے پانچ سو روپے اُسی وقت مل گئے۔

عدم کو مناظرِ فطرت سے عشق تھا۔ جب شام کو آسماں پر پھیلی ہوئی لالہ گوں شفق یا رات کو چاندنی کا نکھار دیکھتے تو اُن پر مدہوشی طاری ہو جاتی۔ اُس وقت وہ بن پیئے جھومنے لگتے۔ عدم تمام دوستوں کا کام بڑی فراخ دلی سے کرتے تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے: ''قمر یورش! اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو بلا تکلّف بتانا، دیکھنا جھجکنا نہیں۔ ہم لوگ آپس میں ہڈیاں پسلیاں ہیں۔'' میں نے کہا: اچھا جی، اگر کوئی کام ہوا تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔''

عدم صاحب کے کئی ملنے والے اُن کی سادگی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُن سے دغا بھی کر جاتے تھے مگر عدم سب پر جان نثار کرتے تھے۔ وہ اُن دِنوں ملٹری اکاؤنٹس آفس میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ میں ایک دوست کے کام کے سلسلے میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: عدم صاحب! یہ میرے دوست اصغر صاحب ہیں، آپ مہربانی کر کے ان کی ضمانت دے دیں، یہ انگلینڈ جانا چاہتے ہیں۔''

عدم کہنے لگے: ''میں تمھارے دوست کو نہیں جانتا، میں تو تمھیں جانتا ہوں۔'' اُنھوں نے اُسی وقت نہ صرف ہمارا کام کیا بلکہ چائے پیسٹری سے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بڑی انکساری سے کہنے لگے: ''قمر یورش! آئندہ بھی کوئی کام ہو تو بلا تکلّف چلے آنا، مجھے اپنا بھائی سمجھنا۔

یہ اُن کی اعلیٰ ظرفی کی نشانی تھی۔ وہ دوسروں کے کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور موقع ملتا تو پیدل ہی چل پڑتے تھے۔

گرمی کا موسم تھا، آسمان پر کالے بادل اُمڈ آئے اور خنک ہوا تند فرّاٹے بھرنے لگی۔ شام کے وقت میں ''خضرِ راہ'' کے دفتر گیا تو وہاں پر یارانِ محفل کی ٹولی جمی ہوئی تھی۔ ظہیر کاشمیری، خیال

امروہوی، انور علیمی، عدمؔ، میاں یعسوب اور دوسرے دوست موجود تھے۔ میاں یعسوب نے کمرے سے جھانک کر کہا: ’’ہائے موسم تو قاتلانہ ہے۔ میں ابھی کچھ منگواتا ہوں۔ پھر وہ خود تیزی سے باہر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو اُن کا تھیلا بھرا ہوا تھا۔ اِتنی دیر میں آسمان پر سیاہ بادل اور بھی گہرے ہو گئے۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے اُس کے دروازے سے باہر کا سارا منظر صاف دِکھائی دیتا تھا۔ یکا یک بجلی چلی گئی، چاروں طرف گُھپ اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکتی تو آس پاس کا ماحول چمک اُٹھتا اور پھر گہری تاریکی میں ڈوب جاتا۔ رِم جھم ہونے کا امکان تھا۔ میاں یعسوب نے میز پر تین چار موم بتیاں جلالیں، موم بتیوں کی روشنی میں یہ ماحول بڑا رومانی اور پُر اسرار لگنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب لوگ میرے لیے اجنبی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو کہیں دیکھا ضرور ہے مگر یہ کون ہیں؟ میں نہیں بتا سکتا اس احساس نے مجھے کس قدر خوف زدہ کر دیا تھا مگر عین اُسی لمحے آسمان پر اِتنے زور سے بجلی کڑکی کہ چونک پڑا اور پھر جیسے یارانِ محفل ایک سہانے خواب کی طرح دِکھائی دینے لگی۔

عدمؔ بہت حسّاس تھے۔ اُن کے احساسات بے حد لطیف تھے۔ اِتنے لطیف کہ ایک اچھا شعر اُنھیں ہفتوں تڑپانے کی قوت رکھتا تھا۔ گوئٹےؔ، شیلےؔ، شیکسپیئر، بائرن، وُڈز ورتھؔ، کیٹس، عمر خیام، غالبؔ، حافظؔ، دوقؔ، ناسخؔ، حاجیؔ، بیدلؔ کے سینکڑوں شعر اُن کی نوکِ زبان پر تھے۔ جب وہ عالمِ مدہوشی میں ہوتے تو شراب و شباب کے موضوع پر بے تکان شعر سُناتے چلے جاتے۔ ایک دن آہ بھر کر کہنے لگے: ’’آہ! میری تمام عمر فائلوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئی۔ کاش میں کسی غنچہ دہن کے ساتھ کسی مرغزار میں بیٹھا ہوا بہار کے گیت گاتا اور ستاروں کے سپنے بُنتا۔‘‘ پھر کچھ رُک کر بولے: ’’مگر یار! یہ محفل بھی بُری نہیں۔ یہ یارانِ میکدہ کی محفل کتنی دلفریب ہے۔ یہ جام ہائے ارغوانی کا دور، یہ رسیلے قہقہے، یہ میٹھے نغمے اور یہ مخلص پیارے دوستوں کا قرب، اے کاش! یہ محفل سدا بہار رہے تو میں اپنی تمام دولت دے کر بھی مُسرت کے چند لازوال لمحے اپنے دوستوں کے لیے خرید سکوں۔‘‘ یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کسی بے نام لذّت سے چُور چُور ہو کر جھومنے لگے۔ عدمؔ کے اُٹھنے بیٹھنے کا انداز قلندرانہ تھا، خاص طور پر جب وہ باتیں کرتے تو اُن کی بھنویں، آنکھیں اور چہرے کا ہر نقش اُن کی آواز

پر رقص کرنے لگتا۔ جب آسمان پر کالے کالے بادل امڈ آتے اور بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی فضا میں خنکی پیدا ہوتی تو عدؔم بے قرار ہو جاتے اور خواہ مخواہ لڑکھڑانے لگتے۔ وہ روزانہ بے شمار غزلیں کہنے کے باوجود دُہائی دیتے تھے کہ میری سرکاری نوکری میری شاعری کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے۔ جب موڈ میں ہوتے تو بڑے پُرسوز ایسے اشعار کہتے کہ روح میں بے قراری سی پیدا ہونے لگتی۔ فطرت سے اُن کا لگاؤ مجھے بے حد پسند تھا بلکہ میری اُن کی دوستی کی بنیاد ہی ان حسین خوابوں پر تھی جو ہم اکٹھے دیکھا کرتے تھے۔ وہ خواب بہتر زندگی کے، امن اور مسرت کے خواب تھے، انسان کے روشن مستقبل کے خواب جو گیتوں سے زیادہ میٹھے اور شبنم سے زیادہ دلکش ہوتے تھے۔ اُن کے پاس رسیلے قہقہے تھے۔ نغمے تھے، رنگین اشعار تھے، بہار ہی بہار تھی۔ جب وہ اس پھیکی اور کھوکھلی اور بے رنگ زندگی میں خوشیوں کے، نغموں کے، شعروں کے رنگا رنگ پھول کھلاتے تو وہ خوش ہوتے تھے۔ وہ کوشش کرتے کہ ان حسین و رنگین پھولوں کی تازگی اور رعنائی پر خزاں کا منحوس سایہ نہ پڑے۔ جب اس محفل میں کوئی اڑچن پیدا ہوتو عدؔم اپنے شاداب ہونٹوں پر ایک پُر نور مسکراہٹ لا کر دوستوں سے کہتے: ''حضور! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب تک یہ غلام زندہ ہے۔''

اُس رات بھی جب بجلی آ گئی تو وقت بہت ہو گیا تھا۔ شب کی زلفیں بھیگ چکی تھیں۔ میاں یعسوب اور ظہیر کاشمیری نے میرے خلاف سازش کی اور میری ڈیوٹی لگائی کہ میں عدؔم کو اُن کے گھر چھوڑ کر آؤں۔ مدہوش عدؔم کو قابو کرنا بدمست ہاتھی کو قابو کرنے کے برابر تھا لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش میں عدؔم کو لے کر میکلوڈ روڈ پر آ گیا۔ لاہور ہوٹل کے قریب ہمیں ایک تانگے والا ملا۔ اُس نے فرشی سلام کر کے پوچھا: ''حضور! کہاں جائیں گے؟'' عدؔم نے بڑی شانِ بے نیازی سے کہا: ''چھاؤنی'' کوچوان نے کہا: ''دس روپے کرایہ ہوگا۔ ہم نے سالم تانگہ لیا۔ عدؔم اگلی سیٹ پر اور میں پچھلی سیٹ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے پھرتی سے چابک سنبھال کر گھوڑے کو چمکارا اور تانگہ اسٹیشن کا موڑ کاٹ کر علامہ اقبال روڈ پر چلنے لگا۔ چاروں طرف جگمگاتی بتیوں کا جال پھیلا تھا۔ راستے میں کئی انجانے چہرے دم بھر کے لیے اُبھرتے اور رنگا رنگ روشنیوں میں دمک کر اندھیروں میں ڈوب جاتے۔ دُور

سے چہرے مجھے رنگا رنگ کے فانوسوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جو ہاتھ سے نکلتے ہی آسمان کی طرف پرواز کر جاتے ہیں۔ فضا میں ایک عجیب سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی نا قابلِ فہم آوازیں لہروں کی طرح فضا میں اُبھرتیں اور آہستہ آہستہ ڈوب جاتیں۔ یہ نظارہ میرے دل میں ایک کسک پیدا کر رہا تھا۔ جب ٹانگہ دھرم پورہ نہر کے قریب پہنچا تو وہاں دودھیا رنگ کی روشنی کا سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ بھیڑ بھاڑ زیادہ نہ تھی۔ لوگ خاموشی سے آ جا رہے تھے اور جگمگاتے قمقموں کی روشنی میں اُن کے چہرے بڑے پُر اسرار دکھائی دے رہے تھے۔ عدؔم نے ایک پنواڑی کی دُکان پر ٹانگہ رکوایا۔ میں نے پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' عدؔم نے کہا: ''ایک کوکا کولا کی بوتل پینی ہے۔'' میں نے کوکا کولا کی بوتل لی اور عدم کو پکڑا دی۔ پھر عدم نے کہا: ''ایک بوتل تم پیو گے، تب میں پیوں گا۔'' میں نے اپنے لیے ایک بوتل اور لے لی، پھر عدم نے کہا: ''ایک بوتل کوچوان پیئے گا، تب میں پیوں گا۔'' میں نے ایک بوتل کوچوان کو بھی لے کر دی۔ پھر عدؔم نے کہا: ''ایک بوتل گھوڑا پیئے گا تب میں پیوں گا۔'' میں سمجھ گیا کہ عدؔم صاحب شرارت پر تُل گئے ہیں۔ میں نے عدم کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا: ''عدؔم صاحب! تماشا نہ بنیں۔ لوگ ٹانگہ کے گرد جمع ہو گئے ہیں، جلدی سے پیسے نکالیے۔ پنواڑی آپ کو نہیں جانتا کہ آپ شاعر عدؔم ہیں۔ وہ مجھے ایسے بھی غنڈہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ آپ کو پیسے نہ دینے پر اٹھا کر نہر میں پھینک دے گا، پھر آپ آرام سے عدم آباد پہنچ جائیں گے۔'' یہ سُن کر عدؔم نے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اُس پنواڑی کو دیا۔ اب مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ عدؔم بقیہ پیسے نہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے پنواڑی سے پیسے لے کر زبردستی عدؔم کی جیب میں ڈالے اور ٹانگہ لے کر آگے چلا گیا۔ میرے دل میں یہ خدشہ تھا شاید عدم کی جیب میں پرمٹ نہ ہو اور ہم پکڑے جائیں، رات حوالات میں رہنا پڑے۔ ٹھیک ہے، صبح ضمانت تو ہو جاتی مگر یہ سب مصیبت تو تھی۔ آخر چلتے ہوئے عدؔم کی کوٹھی آئی۔ ہم ٹانگے سے اُترے۔ کوچوان کو کرایہ دیا۔ جب عدؔم نے ڈرتے ڈرتے اپنی کوٹھی کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اُن کا چھوٹا لڑکا نکلا۔ عدؔم نشے کی حالت میں اپنے چھوٹے کے سامنے نہایت مظلوم بن کر ادب سے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور روتے ہوئے اپنے لڑکے سے کہنے لگے: ''میں تو پیتا ہی نہ تھا'' پھر میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: ''اِسی شخص نے

مجھے زبردستی پلائی ہے۔'' اور ساتھ ہی کوٹ کی جیب سے مُٹھی بھر نوٹ نکال کر اپنے بیٹے کو دِکھانے لگے کہ میرے پاس پیسے بھی ہیں۔ اُن کا چھوٹا صاحب زادہ مجھے اور میاں یعسوب کو تڑاتڑ گالیاں دینے لگا۔ میں گالیاں کھا کر وہاں سے چُپکے سے کھسک آیا۔ میری عدمؔ سے آخری ملاقات دوپہر کے وقت انارکلی بازار میں ہوئی۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ انارکلی میں خریداری کے لیے جا رہے تھے۔ آگے آگے بیگم صاحبہ تھیں اور پیچھے عدمؔ بڑے فرماں بردار قسم کے شوہر کی طرح جا رہے تھے۔ اب اُن کی صحت بُری طرح گر چکی تھی۔ وہ سوکھ کر بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے البتہ چہرے پر ویسی ہی معصومیت تھی۔ وہ اپنی بیگم کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر یوں چل رہے تھے جیسے کوئی خلانورد چاند کی زمین پر چل رہا ہو۔ مجھے جو شرارت سوجھی میں نے عدمؔ کے کوٹ کا دامن کھینچ کر کہا: ''رن مرید عدمؔ جا رہا ہے۔'' پھر کیا تھا، اِتنا کہنے کی دیر تھی جیسے بارود میں آگ لگ گئی۔ عدمؔ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھگت کبیر کی طرح سر را ہے رونے لگے۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ میں دوسری طرف مُنہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے یہ سمجھا بڑے میاں کی جیب کٹ گئی جو رو رہے ہیں۔ کسی نے پوچھا ''بڑے میاں! کیوں رو رہے ہو؟'' اُن کی بیگم نے بھی پوچھا: بات کیا ہے؟ کیوں آپ شور مچا رہے ہیں؟'' عدمؔ صاحب نے روتے ہوئے کہا: وہ بدمعاش قمر یورش مجھے کہتا ہے ''عدم زن مرید جا رہا ہے۔'' عدمؔ کے مُنہ سے یہ فقرے سُن کر تمام لوگ ہنسنے لگے۔ بیگم کہنے لگیں کہ چلو دفعہ کرو اِس بات کو۔ آپ کو شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے؟ عدمؔ بکھر گئے۔ وہ بضد تھے کہ قمر یورش نے مجھے زن مرید کیوں کہا؟ یہ ہوتا کون ہے ایسی بات کہنے والا؟ پھر اُن کی بیگم بڑی مشکل سے عدمؔ کو سمجھا بجھا کر اُنھیں اپنے ساتھ لے گئیں۔ اس کے بعد میری عدم سے ملاقات نہ ہو سکی۔

ایک روز احمد ندیم قاسمی صاحب نے بتایا کہ عدمؔ نے شراب چھوڑ دی۔ یہ بیسویں صدی کا معجزہ تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ عدمؔ صاحب اب چائے پی رہے ہیں۔

پھر ایک روز خالد احمد نے بتایا عدمؔ نے ڈاڑھی رکھ لی ہے اور آج کل کثرت سے نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ اچانک ایک دن اخبار میں پڑھا کہ وہ اِس فانی دُنیا سے انتقال فرما گئے ہیں۔

یہ خبر مجھ پر ایٹم بم کی طرح گری۔ میں کبھی کبھی عدمؔ کو چڑانے کے لیے کہتا تھا:

اب شہر میں جی نہیں لگتا
عدمؔ جی عدم آباد چلو

اور واقعی؛ عدم آباد چلے گئے۔ دُور اُفق کے اُس پار ستاروں سے بھی آگے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ میں آج اُنھیں یاد کر کے اکیلا اُداس بیٹھا ہوں۔

☆☆☆☆☆

حزیں کاشمیری

عبدالحمید عدمؔ

عبدالحمید عدمؔ لاہور کے جانے پہچانے شاعر، ملک مراتب علی تائب کے دوستوں میں سے تھے۔ وہ تائب سے محبت اور عقیدت بھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اشفاق کے ہوٹل واقع قلعہ گوجر سنگھ میں بیٹھے ہوئے ایک بار تائب مرحوم نے شادامرتسری سے کہا کہ ''عبدالحمید عدمؔ کو ہماری محفل میں موجود ہونا چاہیے لہٰذا تم جاؤ اور اُنھیں ابھی یہاں لے آؤ''۔ شادامرتسری نے اُن کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور اُن کے ہاں پہنچ گئے مگر واپس آ کر کہنے لگے کہ'' تائب صاحب! جب میں نے اُنھیں آپ کا پیغام دیا تو کہنے لگے: دیکھتے نہیں ''کتابیں پڑھ رہا ہوں اور شرابیں پی رہا ہوں میں'' اِس پر خاموش ہو کر چلا آیا۔ خیر۔

میں نے عبدالحمید عدم کو چند بار مشاعروں میں اور دو بار اشفاق کے ہوٹل میں سُنا۔ عجب کیفیت سے شعر پڑھتے، ایسا معلوم ہوتا اپنا نشہ دوسروں پر طاری کر رہے ہیں۔ اُن کا ہر شعر ساغر سے اُبلتی ہوئی شراب دکھائی دیتا۔ وہ کیف وسرور کے شاعر تھے۔ اُن کی غزل کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی رِندی و بے باکی کی آئینہ دار ہوتی تھی اور انھی اجزاء سے وہ لطیف عاشقانہ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ وہ بھی جگر کے اِس شعر کی عملی تصویر تھے:۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

افسوس! تا حیات اُن سے شراب نہ چُھٹ سکی۔ لیکن اُن کی خوش قسمتی کہ اُن کی زوجہ محترمہ نے اُن کی صحت کا بطورِ خاص خیال رکھا اور اُن کی خوراک میں کسی طرح کمی نہ آنے دی۔ ایک شعر میں اِس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

اے کاش میں اُس شب مر جاتا جب اُس نے کہا تھا رو رو کر
یہ زہر کا ساغر تم نہ پیو ، لاؤ تو اِسے میں پی جاؤں

میں نے اُنھیں ایک بار ایک مشاعرے میں سُنا۔ کئی ہزار سامعین کا اجتماع تھا۔ آپ کو سٹیج پر بلایا گیا تو اُس وقت شراب کے نشے میں تھے مگر بہکے ہوئے نہ تھے۔ عجب کیف و مستی کے عالم میں ایک قطعہ اپنے منفرد لب ولہجہ کے ساتھ اِس انداز میں پڑھا کہ قطعہ کا مفہوم مجسّم ہو کر مادی محسوسات سے ہم آہنگ ہو گیا۔ اُس آن سارے سامعین لطف و سرور کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئے۔ قطعہ یہ تھا:

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے
یہ مُسکراتی ہوئی چیز مُسکرا کے پلا
سرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

عبدالحمید عدمؔ بھرے جسم کے اچھی صحت کے مالک تھے مگر شراب نوشی کے باعث لاغر و معذور ہوتے چلے گئے، پھر اُنھیں موت نے اپنے آہنی پنجہ میں دبوچ لیا۔ مرحوم سادہ لوح، کھرے اور سچے آدمی تھے۔ انسانیت کے داعی اور انسانوں کے ہمدرد۔ مرحوم کے بڑے بھائی، جو پرنٹنگ مشینوں کی خرید وفروخت کا کام کرتے تھے، میرے ملنے والوں میں سے تھے۔ اُن کی زبانی مجھے مرحوم کے بارے میں معلومات ملتی رہتی تھیں۔ مرحوم نے ہزاروں اشعار کہہ ڈالے مگر اُنھیں کتابی صورت میں طبع کرنے کے سلسلہ میں ہمیشہ تساہل سے کام لیا۔ منٹو مرحوم کی طرح اُنھوں نے بھی اپنا کلام معمولی رقم پر بیچ ڈالا۔ چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں: ''نقشِ دوام''، ''خرابات''، ''زُلفِ پریشاں''، ''پیچ وخم''، ''گردشِ جام''، ''قول و قرار'' اور ''شہرِ خوباں''۔ میں نے مرحوم کی شاعری پر ایک مقالہ بعنوان ''خراباتِ عدمؔ'' لکھا تھا جس پر تائب مرحوم نے تحریر کیا تھا: ''حزیں کاشمیری نے خمریاتِ عدم پر قلم اُٹھانے کی جو جرأت کی ہے اس پر وہ ادبی حلقوں کی تحسین کے مستحق ہیں۔ عبدالحمید عدم پنجاب کا ایک قابلِ قدر شاعر ہے اور اس مقالے سے، جو عدمؔ کی شاعری کا ایک طائرانہ جائزے کا حکم رکھتا ہے، شاعر

کے آرٹ کی صحیح حدود متعیّن ہو جاتی ہیں۔''مغربی پاکستان 1951ء'' یہ مقالہ مرحوم کی نظر سے بھی گزرا جس پر راقم الحروف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا گیا۔

حیاتِ عبدالحمید عدمؔ کے دیگر کوائف

سیّد عبدالحمید عدمؔ تلونڈی موسیٰ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں گوجرانوالہ سے قریباً چار میل پر واقع ہے۔آپ کا سنِ پیدائش 1909ء ہے۔ان کے دادا، جن کا اسمِ گرامی سیّد مہتاب شاہ تھا،فوج میں صوبے دار کے عہدے پر فائز رہے۔اُن کے والد گاؤں میں اپنی جائیداد فروخت کرنے کے بعد مستقلاً لاہور چلے آئے تھے۔والد کی وفات کے بعد چونکہ گھر کی کفالت کا بوجھ اُن کے بڑے بھائی اور اُن پر آن پڑا تھا لہٰذا اُنھیں بقایا جائیداد بھی فروخت کرنا پڑی۔اِس سے اُنھوں نے اپنی تعلیم بھی مکمّل کی اور گھر کے اخراجات بھی پورے کرتے رہے۔1927ء میں شادی کی۔اِس طرح ضروریاتِ زندگی میں اضافہ کے باعث تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔اندریں حالات آپ 1928ء میں آڈیٹر کی حیثیت سے ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ راولپنڈی میں ملازم ہو گئے۔پھر مدتِ ملازمت پوری کر کے سبکدوش ہو گئے۔1967ء میں انتقال کر گئے۔شاعری میں نہ تو کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ کسی کو شاگردی کا شرف بخشا۔مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر آیا ہوں اُن کی شاعری کا لب و لہجہ ایک تُند و تیز شراب کی اثر آفرینی لیے ہوئے ہے مگر اِس وصفِ خاص کے ساتھ اُنھوں نے زُلیخائے سُخن کی زلفیں سنوارنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔اِک جذبۂ رِندانہ، اِک شوخیِ مستانہ اُن کے ہر شعر کی پہچان بن گئی ہے۔اُنھوں نے اپنی صہبا کشی سے قال کو حال بنا دیا ہے۔ایک شعر میں فرماتے ہیں:

غرورِ مے کشی کی کون سی منزل ہے یہ ساقی
کھنک ساغر کی آوازِ خدا معلوم ہوتی ہے

نمونۂ کلام

غزلیات

جہاں فقیروں کو گھیر لیتی ہے ناگہاں گردشِ زمانہ
وہاں سے رستہ ضرور جاتا ہے کوئی سُوئے شراب خانہ
یہ کیا ہوا ساکنانِ گلشن کو ، کوئی جا کر خبر تو لائے
نہ کوئی اُڑتا ہوا تبسّم ، نہ کوئی بہتا ہوا ترانہ
مِلے ہیں دل پر نشان دُھندلے سے بارہا تیری اُنگلیوں کے
مِرا تعارف ہوا ہے شاید تری مروّت سے غائبانہ
یہ شا کے سائے ڈس نہ جائیں ، عدمؔ کہیں سے شراب لاؤ
کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے بجھا ہوا ہے شراب خانہ

ارے مَے گسارو! سویرے سویرے
خرابات کے گرد پھیرے پہ پھیرے
بڑی روشنی بخشتے ہیں نظر کو
ترے گیسوؤں کے مقدّس اندھیرے
کسی دن اِدھر سے گُزر کر تو دیکھو
بڑی رونقیں ہیں فقیروں کے ڈیرے
یہ کیا سائے سے اُٹھ رہے ہیں اُفق سے
گلابی گلابی گھنیرے گھنیرے
غمِ زندگی کو عدم ساتھ لے کر
کہاں جا رہے ہو سویرے سویرے

میکدہ تھا ، چاندنی تھی ، میں نہ تھا
اِک مجسّم بے خودی تھی ، میں نہ تھا
طُور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مِری دیوانگی تھی ، میں نہ تھا
وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذّتِ ہمسائیگی تھی ، میں نہ تھا

اکمل علیمی

حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا

عبدالحمید عدؔم 10 اپریل، 1910ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے اور میں نے 1950ء کے عشرے کے شروع میں لاہور میں دیکھا، اُس وقت وہ ملٹری اکاؤنٹس سروس میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر تھے مگر اُن کی وجہِ شہرت وہ مشاعرے تھے جو برطانوی ہند کے تقریباً ہر حصے میں ہوا کرتے تھے اور جن میں عام لوگ عدؔم کے کلام کی سادگی، سلاست اور راست گوئی کی داد دیتے تھے۔ اُردو ادب کے طالبِ علم کی حیثیت اختیار کرنے سے پہلے عدؔم اور میرے درمیان ایک قدرِ مشترک اور بھی تھی جو اُس وقت میرے دائرۂ علم سے باہر تھی۔ ایک آدھ سال پہلے میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک کی سند لے کر نکلا تھا۔ کوئی تین عشرے پہلے عبدالحمید عدؔم اِس سکول میں زیرِ تعلیم تھے اور میرزا ادیب اُن کے ہم جماعت تھے۔ میرزا صاحب لکھتے ہیں کہ عبدالحمید اسلامیات کے مضمون میں بہت لائق تھے۔ کیوں نہ ہوتے؟ انجمن حمایتِ اسلام کی اِس درس گاہ کا آغاز روزانہ اسلامی اساطیر سے ہوتا تھا اور وہی مقرر جو اسلامیات کا اُستاد ہوتا تھا، ظہر کی نماز کا وقت ہونے پر ساری کلاس کو ہانکتے ہوئے دربار داتا گنج بخشؒ کی مسجد میں لے جاتا تھا۔ چند سال بعد جب دربار کی توسیع ہوئی تو ہمارا سکول اُس کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھے اس کی سرخ اینٹیں اور دائیں بائیں گول بُرجیاں پسند تھیں۔ اِس درس گاہ نے شاعر، ادب اور سیاست دان زیادہ پیدا کیے اور سرکاری افسر بہت کم۔ عدؔم بہ امرِ مجبوری سرکاری ملازم اور بہ اُفتادِ طبع شاعر تھے۔

جوانی کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدؔم ایک وجیہ آدمی تھے۔ درمیانہ قد، گول چہرہ، روشن آنکھیں اور حسّاس ہونٹ۔ گلے کو ایک ڈبی دار گلوبند میں لپیٹے رکھتے تھے۔ جب میں نے اُنھیں دیکھا اُن کی عمر کی سہ پہر ہونے کو تھی۔ اُن کے نیم فربہ جسم پر ایک اچکن تھی اور اُنھوں نے سفید قمیص

شلوار کے ساتھ چپل پہن رکھی تھی۔ اُن کے کپڑے زیادہ اُجلے نہیں تھے۔ اس سے مجھے ماسٹر فضل الدین نور یاد آئے جو مولانا علم الدّین سالک کے بھائی تھے اور ہمارے سکول میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ برسرِ عام تادیر مفلر پہننے والوں میں عدؔم اور پروفیسر وقار عظیم دیکھے گئے۔ میں نے قوم پرست نور سے مار کھائی اور کالج میں سالک اور عظیم کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کیا۔ عدم کا سراپا مجھے اب تک یاد ہے۔ میں نے غالباً اُنھیں یعسوب الحسن کے رسالہ ''خضرِ راہ'' کے دفتر میں دیکھا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی ہال میں ہونیوالے مشاعرے کے لیے تیار تھے اور حسبِ معمول مدہوش تھے۔ تاہم اُن کے لب متبسّم تھے اور وہ اپنے آپ میں گم تھے۔

عدؔم سونے کا چمچہ مُنہ میں لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ 1926ء میں والد کا انتقال ہوا تو تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھر کی مالی ذمہ داریاں اُن کے کمزور کندھوں پر آ گئیں۔ ایک رشتہ دار نے کچھ اور تعلیم اور سرکارِ ہند کی ملازمت حاصل کرنے میں امداد کی۔ اُن کو اُمید تھی کہ وہ برسرِ روزگار ہو کر اُن کی بیٹی سے شادی کر لیں گے جو اُنھوں نے کی مگر دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب اُن کا تبادلہ عراق میں ہو تو اُنھوں نے ایک عراقی خاتون سے دوسری شادی کر لی۔ وطن واپس آئے تو گھر کا امن برقرار نہ رہ سکا۔ عراقی بیوی اپنے ملک چلی گئی اور عدؔم پہلی کے ہو رہے۔ خواجہ محمد زکریا نے جو اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی ہوئے، عدم کی کلیات کے ساتھ ایک طویل دیباچہ تحریر کیا ہے اور میں نے عدؔم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک اُنھی کی کتاب سے لی ہے۔ اِس کتاب میں عدؔم کی ایک عادت کا ذکر نہیں۔ وہ بات بات پر اپنے ملاقاتی سے ہاتھ ملاتے تھے۔

عدؔم عام معنوں میں زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر طبیعت موزوں اور قوتِ مشاہدہ نہایت تیز تھی۔ ناشرانِ کتب اُن کے کلام کے اڑتالیس مجموعوں کا اشتہار دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک زودنویس اور بسیار گو شاعر تھے۔ پہلا مجموعہ ''نقشِ دوام'' 1934ء میں شائع ہوا اور تین مجموعے 1981ء میں اُن کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ تاہم اُن کی سب سے مقبول ''خرابات'' ہے۔

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم پر
ہنستا تو ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

فقیروں کا جمگھٹ گھڑی دو گھڑی
شرابیں تِری بادہ خانے تِرے

مَیں مَے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

وہ ملے بھی تو اِک جھجھک سی رہی
کاش تھوڑی سی ہم پیئے ہوتے

شاعر احمد مشتاق جو ہیوسٹن، ٹیکساس میں رہتے ہیں 50 اور 60 کے عشروں میں حلقہ اربابِ ذوق لاہور سے وابستہ تھے۔ ریڈیو پاکستان کے شاد امرتسری جو کسی زمانے میں اُن کے ایک طرح کے اُستاد بھی تھے حلقے کے سرگرم رُکن تھے اور عدؔم سے اُن کی دوستی مسلّم تھی۔ ایک دن احمد نے ٹی ہاؤس میں یاروں کی محفل تلپٹ کرتے ہوئے عدؔم کے ایک شعر کی پیروڈی کی:

اے عدؔم سب گناہ کر لیکن
شاد امرتسری کا یار نہ بن

ریاض خیر آبادی نے خمریات کو سُخن وری کا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا مگر اُن کی مے نوشی ایک استعارہ تھی۔ عدؔم نے بھی خمریات کے مضامین بکثرت باندھے ہیں مگر جیسا کہ بہت سے بہی خواہوں نے دیکھا اُن کی مے نوشی عملی تھی۔ اپنے پیشروؤں کی مانند وہ دن رات ایک طرح کی بے خودی چاہتے تھے مگر مے سے نشاط کا رشتہ برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔ ریاض کی طرح عدؔم کی دلچسپی کا دوسرا بڑا موضوع انسانی حُسن تھا۔

اُس کی نازک اُنگلیوں کو دیکھ کر اکثر عدؔم
ایک ہلکی سی صدائے ساز آتی ہے مجھے

کس نے کھولا ہے ہوا میں گیسوؤں کو ناز سے
نرم رو برسات کی آواز آتی ہے مجھے

تقریباً سو سال پہلے کلیم الدین احمد نے غزل کو ایک نیم وحشی صنفِ سُخن کہا تھا۔ غزل کے

طرف دار اب تک اِس الزام کا ابطال کر رہے ہیں۔ میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ نے غزل کے دَور میں مضمون آفرینی کی۔ اُن کے بعد حالیؔ، اقبالؔ اور اکبرالہ آبادی کی نظم کا غلغلہ بلند ہوا۔ گویا ریزہ خیالی کی جگہ خیالات کی تنظیم نے لے لی۔ جب عدمؔ نے شعر گوئی شروع کی، جوشؔ، حفیظؔ جالندھری اور اخترؔ شیرانی کی نظمیں زیادہ مقبول تھیں۔ قدرتی طور پر جواں سال شاعر اُن سے متأثر ہوئے اور اُنھوں نے اخترؔ تخلّص کر کے نظمیں لکھیں مگر جلد ہی اُن کو احساس ہو گیا کہ یہ اُن کا میدان نہیں ہے۔ تب اُنھوں نے سیّد عبدالحمید عدمؔ بن کر غزل گوئی کی اور جگر کے ہم پلہ ہوئے۔ غزل کا گانا ہمیشہ آسان اور مؤثر تھا چنانچہ بیگم اختر سے لے کر مہدی حسن تک بے شمار گلوکاروں نے غزل کو عوامی بنانے میں حصہ لیا۔ اب پھر نظم نے غزل کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔

عدمؔ کی غزل کی جو خصوصیت اُنھیں معاصرین سے ممیّز کرتی ہے وہ اُن کی سلاست ہے۔ سہلِ ممتنع جو اُردو شاعری میں ہمیشہ پسندیدہ رہا عدم کی غزل کا خاصا ہے۔ اُن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے لغت پاس رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ خصوصیت ان کے اشعار کو روزمرّے کا درجہ دیتی ہے۔

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

کس قدر بوجھ تھا گناہوں کا
حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا

کتنی بے ساختہ خطا ہوں میں
آپ کی رغبت و رضا ہوں میں

آپ نے خوب مجھ کو پہچانا — واقعی سخت بے وفا ہوں میں
آج ہم تو نہیں کسی قابل — آج تم خود کچھ انتظام کرو
جب بھی سجدہ کرو خدا کو عدمؔ — اپنے وجدان کو امام کرو

عدؔم کے عہد میں غمِ جاناں پر غمِ دوراں کا مکمل غلبہ نہیں ہوا تھا۔ ترقی پسندوں کا غول ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جوؔش ترقی پسند ہو کر بھی اپنے آپ کو اُن سے بالاتر خیال کرتے تھے، اِس لیے اُنھوں نے غلام ربانی تاباں سے طنزاً کہا تھا: ''آفریں بر غلام ربانی کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس''
عدؔم اِس جلوس کی ہاؤ ہُو سے بھی متأثر نہ ہوئے اور اپنی رومانوی ڈگر پر چلتے رہے۔ ہر اچھے اہلِ قلم کی طرح اُنھوں نے اپنا اسلوب ایجاد کیا۔ جریدہ ''فنون'' کے غزل نمبر میں اپنی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے والد بسلسلہ روزگار لائل پور میں مقیم تھے جب ہماری تشریف آوری ہوئی۔ گفتگو میں پُرتکلّف الفاظ اور تراکیب کا بکثرت استعمال ایک ذاتی زبان بنانے کے مترادف ہے جسے منیر نیازی نے آگے بڑھایا۔ ''خرابات'' کابل کا ایک قدیم محلّہ ہے جس سے وابستگی میں بہت سے افغان موسیقار اور دانشور فخر محسوس کرتے ہیں۔ عدؔم نے اِس لفظ کو میکدے کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور 'خرد'، 'حشر'، 'شہرِ فرہاد'، 'قصرِ شیریں'، 'بربطِ جام'، 'نصابِ دل'، 'رمِ آہو'، 'بالِ ہما'، 'چاکِ پیراہن' اور خو عدؔم کو نئے معنے پہنائے ہیں اسی طرح کوئی شاعر صاحبِ اسلوب کہلاتا ہے اور یہ اسلوب اُس کی پہچان بنتا ہے۔

سُنتے ہیں کہ آخر میں اُن کے اعضائے رئیسہ ناکام ہو گئے تھے پھر بھی اُنھوں نے ستر سال عمر پائی جو اُن کے زمانے میں طبعی تھی۔ پہلے وفا شعار بیوی نے خیر باد کہا اور پھر خود اِس دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ وہ اپنی زندگی کا ماحصل یوں بیان کرتے ہیں:ـ

موت کتنی بھی سنگ دل ہو مگر
زندگی سے تو مہرباں ہوگی

☆☆☆☆☆

صادق نسیم

سیّد عبدالحمید عدمؔ

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ زندگی نہیں گزارتے، زندگی لوگوں کو گزارتی ہے۔ چند ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو زندگی کی راہوں کے خود موڑتی ہیں۔ عدمؔ صاحب بھی اُن میں سے ایک تھے۔ زندگی کے تقاضے چاہے کچھ بھی ہوں عدمؔ زندگی کو اپنے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق چلاتے تھے۔

میں مَے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

عدمؔ پیدا تو گوجرانوالہ میں ہوئے لیکن اُنھوں نے آنکھیں پنڈی میں کھولیں۔ فضل الرحمٰن اشکؔ مرحوم سے روایت ہے کہ عدمؔ کو سب سے پہلا شوق کرکٹ سے ہوا۔ پنڈی کے چھوٹے سے شہر میں اُنھوں نے اپنی ٹیم پیدا کر لی اور جنون کی حد تک کرکٹ کھیلا کرتے، حالانکہ اُن دِنوں پنڈی کی "سٹی گیم" ہاکی تھی۔ کرکٹ کے کھیل کے دوران سگریٹ پینے کا شوق ہوا تو اعلیٰ قسم کے سگریٹ انگلیوں میں دبائے سُوٹے پر سُوٹا لگاتے رہے اور اسی راستے سے منزلِ شراب پر آ پہنچے۔ یہ بات سمجھنا غور طلب ہے کہ عدمؔ نے شراب کو پیا یا شراب نے عدمؔ کو۔ لیکن وہ اپنی خمریاتی شاعری کو زندۂ جاوید کر گئے اور خود بھی زندۂ جاوید ہو گئے۔

مَے پی رہا ہوں آ مِری سیرت بھی دیکھ لے
اِس وقت آئینے میں اُتارا ہوا ہوں میں

وہ زندگی کے ساتھ کبھی اُلجھے نہیں لیکن اپنا راستہ سدا جدا رکھا۔ زندگی سے اُلجھے نہ زندگی کو اپنے ساتھ اُلجھنے دیا۔ پیدل دفتر جا رہے تھے۔ سگریٹ کی طلب ہوئی، سُلگانا چاہا تو ہوا مخالف تھی۔ ہوا کی طرف پیٹھ کر کے سگریٹ سُلگا لیا تو ہوا کے رُخ کی مناسبت سے واپس گھر کو چل دیے۔

میں نے ۱۹۴۴ء میں شعر کی دُنیا میں آنکھیں کھولیں تو عدمؔ تمام برِّصغیر پر اپنی خمریاتی شاعری کی وجہ سے چھائے ہوئے تھے۔

کون ہے جس نے مَے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے
مے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

☆☆☆☆☆

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے
یہ مسکراتی ہوئی چیز مسکرا کے پلا
سرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

اِس رنگ کے ہزاروں اشعار اور سینکڑوں قطعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں طنز کے ہلکے سے پہلو اور شوخی کی وجہ سے ہم نے بھی اُن کے ساتھ ایک شوخی کی۔

وہ ۱۹۴۶ء میں پنڈی کے ''کلکتہ دفتر'' (سی ایم اے) میں پوسٹ ہو کر آئے۔ یہاں کی ''بزمِ جملہ مسافرین'' نے خیر مقدم میں ایک چائے پارٹی دی۔ اُن کی ذاتِ گرامی، شاعری اور زندہ دلی کی مناسبت سے چند تقریریں بھی ہوئیں۔ ہر پانچ منٹ کی تقریر کے بعد تان اُن کے کسی شعر کی ''پروڈی'' پر ٹوٹی۔

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

اِس شعر کو یوں پڑھا گیا:

تخلیقِ احتساب کے دلچسپ جرم پر

ہنستا تو ہوگا آپ بھی آڈٹ کبھی کبھی

عدمؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے برجستہ جواب دیا: ''اگر یہ شعر آپ کا ہے تو آپ کو مبارک باد، اگر میرا ہے تو نہ صرف مجھ پر بلکہ میری آل اولاد پر بھی لعنت بھیجئے۔'' دوسرا مقرر اُٹھا، عدمؔ کی توصیف کرتے ہوئے اُن کا یہ شعر:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

اِس شعر کی تان اِس طرح توڑی:

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

عدمؔ صاحب نے برجستہ کہا: ''مصرع بدلنا ہی تھا تو یوں فرماتے 'شاید مجھے نکال کے کچھ پی رہے ہوں آپ' تب عدمؔ کا مصرع لگتا۔''

میری باری آئی تو میں نے اُن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے اُن کا یہ شعر:

رُخ سے نقاب اُٹھا کہ بڑی دیر ہو گئی
ماحول کو تلاوتِ قرآن کیے ہوئے

اِس طرح پڑھا:

رُخ سے نقاب اُٹھا کہ سوا سات بج گئے
ماحول کو تلاوتِ قرآں کیے ہوئے

عدمؔ صاحب نے بے ساختہ فرمایا: ''بلّے اوئے کِسے گھڑی ساز دیا پُترا۔''

عدمؔ صاحب نے گلے سے ہار اُتار دیے۔ ہم سب نے اُنھیں باری باری زبردستی گلے لگا لیا۔ وہ جھٹ راضی ہو گئے اور یہ زعفرانِ زار محفل ہنستے کھیلتے ختم ہوئی۔ عدمؔ صاحب نے جاتے ہوئے یہ

عجیب قسم کا فقرہ فرمایا: ''اسی پدھرے تے ہوئے ہی ساں تُسی ساڈے تے اِستری وی پھیر چھڈی اے۔''

عدمؔ صاحب ہمارے مہمانِ عزیز تھے ان سے یہ چھیڑ خانی جان بوجھ کر کی گئی تھی۔ جب اُن کے اعزاز میں میزبان محفل سجانے پر اتفاق کیا گیا تو ''جملہ مسافرین'' میں سے کچھ احباب نے اعتراض کیا کہ وہ خداوند تعالیٰ، مذہب اور مذہبی لوگوں سے بہت چھیڑ چھاڑ کی شاعری کرتے ہیں لہٰذا اُن سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ کے ثبوت میں متعدد اشعار پیش کیے گئے، چند ایک یاد رہ گئے ہیں:

زاہد کی شکل دیکھ کے یزداں بھی ہنس پڑا
مہمل سا اِک صحیفۂ حمد و درود تھا

اِس قدر بوجھ تھا گناہوں کا
حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا

اندازِ بد مزاجیِ واعظ نہ پوچھیئے
میں پی رہا تھا آپ کو تکلیف ہو گئی

اے خدا ! تیرے چاہنے والے
تنگ کرتے ہیں تیرے بندوں کو

باغِ جنت کے سبز پیڑوں سے
باندھ اپنے نیاز مندوں کو

یہاں ''باندھ'' کا لفظ نہایت خوب صورت انداز میں باندھا گیا ہے۔ اس کا لطف وہی اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے گھر کی حفاظت کے لیے کُتا پال رکھا ہو۔

میں ہزار بار توبہ کر کے آپ کو عدمؔ صاحب کا ایک غیر مطبوعہ شعر سُناتا ہوں، صرف اِس لیے کہ آپ ملاحظہ فرمالیں کہ وہ چھیڑ خانی، طنز اور مزاح میں خداوند تعالیٰ کے ساتھ کس حد تک جا سکتے تھے:

جی خوش ہوا ہے مسجدِ ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

عدؔم صاحب ملحد تھے یا نہیں یہ علیحدہ بحث ہے۔ دراصل وہ ایسے ملحدانہ اشعار اِس لیے کہتے تھے کہ سُننے والے ''ہاں ہاں'' کریں اور وہ اس کا مزہ لیں۔

عدؔم صاحب کے پنڈی آ جانے کی وجہ سے نوجوان شاعروں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہر ایک اُن کا احترام کرتا اور اُن سے قرب کا خواہش مند رہتا۔ ایک دن میرے محلّے دار برادرم احمد ظفؔر اُنھیں اپنے گھر لے گئے اور رات اُن کے ہاں شب بسری پر اصرار کیا۔ عدؔم صاحب نشے میں تو خیر تھے ہی، وہاں جا کر مزید مَے کشی سے بدمست ہو کر سو گئے۔ احمد ظفر صاحب کے والد صاحب ایک صاحبِ قرینہ بزرگ تھے۔ گھر بھی نہایت عمدگی سے سجا رکھا تھا۔ عدؔم صاحب نے رات اُن کی سجی سجائی بیٹھک میں گزاری۔ صبح نہایت اطمینان سے اُس کمرے کے قالین پر وہی حرکت فرما دی جو جنرل یحییٰ خان نے ایران کے شاہی محل کے باغیچے کی آبیاری کے سلسلے میں فرمائی تھی۔ بلکہ جنرل موصوف سے بھی کچھ زیادہ ہی دور نکل گئے۔ ایرانی قالین سیراب ہی نہ کیا کھاد بھی مہیّا کر دی اور وہاں سے غائب ہو گئے۔ کسی کو پتہ نہیں بے چارے احمد ظفر پر اُن کے سخت گیر والد کے ہاتھوں کیا گزری۔ بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ میں نے ہمت کر کے عدؔم صاحب سے گِلہ کیا تو عجب تمسخر سے فرمانے لگے: ''حضور! احمد ظفر ہر روز اصرار کرتا تھا کہ کبھی میرے غریب خانے پر قیام فرما کر مجھے عزت عطا فرمائیے۔ وہاں تنور کی روٹی اور سالن کے ساتھ شراب کون پی سکتا تھا۔ میں نے جبر کر کے ان لوازمات کے ساتھ شراب پی۔ صبح یہ سوچ کر ایسی حرکت کا مرتکب ہوا کہ آئندہ وہ کبھی مجھے اپنے ہاں رات بسر کرنے پر اصرار تو کیا یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا۔ میں نے یہ سب کچھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کے لیے کیا۔''

نواب اشک رام پوری کی محفل جمی تھی۔ نواب صاحب غزل سرا تھے۔ لوگ داد دے رہے تھے۔ ایک غرض مند شاعر جو نواب صاحب کے ذریعے پیر صاحب گولڑہ شریف سے کوئی کام نکلوانا چاہتے تھے داد دینے میں کچھ کچھ اُچھل بھی رہے تھے۔ عدؔم صاحب بھی شریکِ محفل تھے۔ نواب

صاحب نے جب یہ شعر پڑھا:

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للہ چلے جائیے مے خانے سے

اُچھل اُچھل صاحب کچھ زیادہ ہی اُچھل کر عدؔم صاحب سے مخاطب ہوئے: ''کیوں عدؔم صاحب! کوئی پنجابی شاعر اِس انداز کا شعر کہہ سکتا ہے۔'' عدؔم صاحب نے جواب دیا: ''جی ہاں اگر کوئی پنجابی یہ شعر کہتا تو شعر یوں ہوتا:

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا مار کے لات
اُٹھ اوئے ایتھوں دفع ہو جا

محفل میں زوردار قہقہہ پڑا۔ اُچھل اُچھل صاحب نے کہا: ''عدم صاحب! پنجابی مصرع بے وزن ہو گیا۔'' عدؔم صاحب نے مسکرا کر کہا: ''دراصل ساقی نے سارا وزن پہلے مصرع کی لات مارنے میں استعمال کر لیا تھا۔''

نواب صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ اُچھل صاحب تو محفل سے اُٹھ کر چلے گئے۔ عدؔم صاحب نواب صاحب کے پاؤں پر گر کر کہنے لگے: ''حضور! میں آپ سے معافی کا خواست گار ہوں۔ خاموش تو میں اُنھیں کرانا چاہتا تھا، زد میں آپ کا شعر آ گیا۔''

نواب صاحب نے عدؔم صاحب کو تو معاف کر دیا لیکن اچھی خاصی محفل اختتام پذیر ہو گئی۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب تقسیمِ ہندرُو پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ''اہلِ زبان'' پنجابی شعراء کو ازراہِ تمسخر ''ڈھگا'' کہہ کر چھیڑتے تھے اور پنجابی ''اہلِ زبان'' کو ''تلیر''۔ اب تو ماشاءاللہ تلیر اور ڈھگے یک جان دو قالب ہو چکے ہیں۔

ایک رات کی تو کوئی بات نہیں، کئی دفعہ تین تین چار چار راتوں کا غوطہ مار جاتے۔ گھر میں کہرام مچ جاتا۔ نواسوں اور بیٹی کو روتا نہ دیکھ سکتے تو بڑے شاہ جی عدؔم صاحب کی تلاش میں نکلتے۔ اُن کے ایک ایک ٹھکانے پر جا کر اُن کی ٹوہ لگاتے۔ کئی دفعہ اُنھیں اُس بازار کے کسی بالا خانے سے جابر آمد

کرتے تو وہاں جانے سے بڑا اجاب اور خجالت بھی محسوس کرتے لیکن واہ رے شاہ جی! اِس بات کا اپنی بیٹی سے ذکر تک نہ کرتے کہ اُسے مزید صدمہ نہ ہو۔ ایک دفعہ اُس بازار کے بالا خانے جھانکتے ہوئے بڑے شاہ جی کو ایک محلّے دار نے دیکھ لیا۔ اُس نے سفید ریش شاہ صاحب پر طنز کر دی ''ہائے ہائے شاہ جی! چِٹی داڑھی تے آٹا خوار۔'' شاہ جی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جب شاہ جی نے اُسے آنے کا مقصد بتایا تو وہ ہمراہ ہولیا اور عدمؔ صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ بالا خانوں میں دودھ بیچا کرتا تھا۔ پس عدمؔ صاحب کو دیکھتے ہی بازو سے پکڑتا اور گھر پہنچا آتا۔ عدمؔ صاحب اُس سے خاصے نالاں تھے۔ اکثر فرمایا کرتے:

''یہ شیطان کی پوچھل کہاں سے میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ زندگی کا سب لطف ہی جاتا رہا۔''

باقی صدیقی ایک پرہیز گار قسم کے باصفا بزرگ تھے۔ پہلے فطرت صاحب کے شاگرد تھے پھر عدمؔ صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ جب عدمؔ لاہور سی ایم اے پی میں پوسٹ ہو کر چلے گئے تو باقی صاحب بھی پنڈی کے روزگار پر لات مار کر لاہور جا پہنچے اور وہیں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لی۔

عدم صاحب لاہور چھاؤنی، باقی لاہور شہر۔ درمیان میں ۶ میل کی مسافت۔ ایک دن غزل کہی چھاؤنی چلے گئے۔ عدمؔ اپنی ترنگ میں مست تھے۔ طے یہ ہوا کہ غزل چھوڑ جایئے، بعد میں اصلاح کر دی جائے گی۔ باقی صاحب بھی شراب کے بھبھکوں کی بدبو سے بے زار ہو رہے تھے۔ لوٹنے ہی والے تھے کہ عدمؔ صاحب کو اُن پر ترس آ گیا۔ سائیکل نکالی کہ آؤ تمھیں شہر چھوڑ آؤں۔ باقی کے لیے سائیکل کے کیریر پر واپسی کا سفر عجب جاں گسل تھا۔ یا اللہ خیر کا وِرد کرنے لگے۔ عدمؔ اور سرور میں آ گئے اور وہ مزید بے احتیاطی اور تیز رفتاری سے سائیکل چلانے لگے۔ لاہور پہنچے تو باقی سجدے میں گر گئے۔ عدمؔ صاحب پاس بیٹھے مسکرا رہے تھے، فرمانے لگے: ''ارے او باقی! تم اِن موٹر کاروں اور تانگوں سے ڈر گئے۔ خدا کی قسم مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری سائیکل کے اِرد گرد چوہے دوڑ رہے ہیں۔''

باقی صاحب نے نہ صرف غزل لاہور چھوڑی بلکہ ایسے خوف زدہ ہوئے کہ نوکری ہی چھوڑ کر پنڈی واپس آ گئے۔

لاہور میں عدم صاحب کی ظہیر کاشمیری سے گاڑھی چھننے لگی۔ وہ فلموں کے گیت اور مکالمے لکھتے تھے۔ اُنھیں اسٹوڈیو سے پیسے ملے۔ عدؔم کو فون کیا وہ دفتر کا کام چھوڑ کر فوراً اسٹوڈیو آ دھمکے۔ ظہیر کا ذکر کرنے سے پہلے اُن کا حُلیہ لکھنا ضروری ہے۔

سُرخ و سپید رنگ، سُرخ بال، سُرخہ ہونے کی وجہ سے بنیان اور ازار بند تک سُرخ پہنتے تھے۔ اسٹوڈیو سے باہر آئے تو چوکیدار کوئی نیا تھا۔ فوراً اپکار اُٹھا: ''مڑا خو کہاں جاتا ہے پہلے میک اپ اُتار کر جاؤ۔''

شراب کی ایک دُکان پر ایک دیہاتی ظہیر پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا۔ ظہیر حیران ہو کر پوچھنے لگے: ''کیوں بابا جی! کیا بات ہے۔'' دیہاتی نے معذرت کر کے پوچھا: ''بابو جی معاف کرنا تُسی مہندی تے نہیں کھاندے۔'' بات آئی گئی ہو گئی۔ دونوں پی پلا کر ہیرا منڈی گانا سُننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ تانگہ لیا اور چل پڑے۔

تانگے والا ان پڑھ لیکن علامہ اقبال کا شیدائی تھا اور سواریوں سے گفتگو کرنے کا عادی۔ ان حضرات کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ شاعر ہیں تو کہنے لگا: ''باؤ جی! ڈاکٹر اقبال بھی واہ وا شاعر سن۔'' ظہیر کو غصّہ آ گیا۔ کہنے لگے: ''تم گفتگو کم کرو اور گھوڑے کو تیز چلاؤ جو تمھارے باپ ڈاکٹر اقبال کی طرح چلتا کم ہے اور تفکر زیادہ کرتا ہے۔''

تانگے والے کو اُن پر نشے میں ہونے کا غصّہ تو پہلے ہی تھا، اقبال کے سلسلے میں بدکلامی پر تاؤ میں آ گیا۔ دونوں کو تانگے سے اُتار کر ایک ایک چابک رسید کیا۔ لوگوں نے چھڑاؤ کیا۔

ہیرا منڈی ایک چوبارہ میں پہنچے۔ طوائف کو کوئی اچھی غزل سُنانے کی فرمائش کی۔ اُس نے علامہ کی غزل شروع کی۔ اور تماشائی بھی موجود تھے۔ عدؔم صاحب نے ظہیر سے کہا: ''یار توں اقبال توں ہُنی ہُنی تانگے والے توں مار کھادی ہے، وہ تمھارا باپ یہاں بھی موجود ہے۔'' اقبال کی شان میں گستاخی پر وہاں کے تماش بینوں نے بھی اُنھیں باہر کی راہ دِکھائی۔ عدؔم صاحب فرماتے تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم نے سیڑھیاں کیسے رول بیک کر کے طے کیں۔ مار کٹائی کی ایک ہی جست اور دھکے

نے ہمیں بالا خانے کی اوپر والی سیڑھی سے سڑک پر پہنچا دیا۔

ملتان میں مشاعرہ تھا۔ رات ایک بجے ختم ہوا تو راقم الحروف کو ہوٹل کے سب سے اوپر والے کمرے میں جگہ دی گئی۔ میں سونے ہی کو تھا کہ نیچے کمرے سے چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ تمام شاعر بھاگ کر نیچے پہنچے تو ظہیر کاشمیری اور عدمؔ صاحب آپس میں گتھم گتھا تھے۔ تکرار نہ جانے کس بات پر ہوئی تھی لیکن عدمؔ صاحب مصر تھے کہ یہ چیز کیا ہے۔ ''میں اگر پھونک ماروں تو اُڑ جائے۔'' عدمؔ صاحب زور سے پھونک مارتے تو ظہیر چیخ پڑتا: ''خدا کی قسم اِس کی پھونک مجھے تلوار کی طرح لگتی ہے۔'' صبح ہونے کو تھی۔ عدمؔ صاحب کی ریل گاڑی کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ سب نے میری ڈیوٹی لگائی کہ انھیں ریل گاڑی میں سوار کرآؤں۔ میں بادلِ ناخواستہ عدم صاحب کو ہمراہ لے کر چل پڑا۔

راستے میں ایک تانگہ ہمارے قریب سے گزرا۔ اُس کی پچھلی سیٹ پر ایک نورانی شکل والے بزرگ سوار کہیں جا رہے تھے۔ عدمؔ صاحب نے چِلّا کر کہا: ''مجھے آپ کی صورت میں اللہ نظر آ رہا ہے، خدا کے لیے ٹھہریے۔'' وہ رُک گئے۔ تانگے سے اُترے۔ عدمؔ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُن کی ڈاڑھی کا بوسہ لے لیا۔ شراب کی بدبو سے وہ بزرگ غُصے میں آ گئے، کہیں عبادت کے لیے جا رہے تھے۔ چھڑی لے کر عدمؔ صاحب پر جھپٹے۔ عدمؔ آگے آگے اور بزرگ پیچھے پیچھے، ساتھ والی گلی میں غائب ہو گئے۔ میں اور تانگہ بان حیران کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر میں بزرگ سانس پھولے ہوئے وارد ہوئے اور تانگے میں سوار ہو کر چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں۔ عدمؔ صاحب کو ڈھونڈنے گلی کی جانب مُڑا تو ایک طرف سے آواز آئی: ''صادق نسیم! میں یہاں چُھپا کھڑا ہوں، وہ خواجہ خضر چلے گئے ہوں تو میں باہر نکلوں۔'' غرضیکہ ان عجیب حالات مین ٹکٹ لے کر گاڑی میں بٹھا کر میں لوٹا تب تک سورج خاصا نکل چکا تھا۔

کشفی ملتانی سے روایت ہے مظفر گڑھ میں مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا مگر عدمؔ صاحب چند مے گسار احباب کے ساتھ محوِ ناؤ نوش تھے۔ کافی دیر ہو چکی، بوتل دو تہائی خالی ہو چکی تھی۔ طے پایا کہ سب مشاعرے میں چلتے ہیں۔ باقی واپسی پر پی لیں گے۔ عدمؔ صاحب سب سے پیچھے آ

رہے تھے۔ خاموشی سے واپس ہو گئے اور باقی ایک تہائی بوتل بھی نوش فرمالی اور اُس بوتل پر نشان لگا کر اُس میں اُتنا ہی ایک غلیظ مشروب بھر دیا، پھر اُسے الماری میں رکھ کر مشاعرے میں چلے گئے۔ سب کے ہمراہ واپس آئے اور مزید پینے سے انکار کر دیا۔ باقی احباب نے اسی مشروب کے دو دو پیگ لگائے تو شاکی ہوئے سرور نہیں آ رہا۔ عدؔم نے بستر سے سر نکال کر کہا: ''سرور کیسے آئے ساتھیو! پتہ بھی ہے کیا پی رہے ہو۔'' پس وہ شور مچا کہ اہلِ خانہ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ ڈی سی صاحب نے آ کر معاملہ ٹھنڈا کیا۔

ایک دفعہ پشاور تشریف لے گئے۔ قیام سید مظہر گیلانی کے ہاں تھا۔ ظاہر ہے کہ شراب کا بندوبست میزبان ہی کے ذمہ تھا۔ رات کافی دیر تک پیتے رہے۔ مدہوش ہو کر سو گئے۔ صبح اُٹھتے ہی مظہر صاحب نے شراب کی بوتل الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ ناشتے کے تھوڑی دیر بعد مظہر صاحب نے کچھ دیر کے لیے اجازت چاہی کہ ایک ضروری کام سے جانا ہے، جلد ہی آ جاؤں گا۔ عدؔم صاحب نے یوں جواب دیا: ''حضور! شوق سے تشریف لے جائیے لیکن ایک تکلیف فرماتے جائیے، مجھے تو الماری سے نکال جائیے تاکہ میں آرام سے آپ کا انتظار کر سکوں۔''

فسادات کا زمانہ تھا۔ انارکلی کے کسی بالا خانے پر عدؔم صاحب کسی سکھ دوست کے ساتھ پی رہے تھے۔ ساتھ ساتھ شاعری بھی چل رہی تھی۔ عدؔم صاحب نے شعر پڑھا:

عدؔم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

سکھ دوست خلوص کے نام پر اُلجھ پڑا۔ کہنے لگا: ''آپاں دا خیال اے خلوص ناں دی کوئی شے ہوندی ای نئیں۔'' بحث نے طول کھینچا۔ سکھ دوست نے کہا: ''کیا تم میں خلوص ہے؟'' عدؔم صاحب نے فرمایا: ''دریں چہ شک۔'' سکھ کہنے لگا: ''اگر میں تمھیں کہوں تو اِس بالا خانے سے چھلانگ لگا دو گے؟'' عدؔم صاحب نے ''یا علی'' کہا اور بسم اللہ کر کے چھلانگ لگا دی۔ وہ تو خیریت گزری کے ایک لچک دار چھٹے پر گرے۔ چھٹہ ٹوٹ گیا۔ عدم صاحب بے ہوش ہو گئے۔ باہر کرفیو تھا۔ پولیس نے عدؔم صاحب کو ہسپتال پہنچا دیا اور سکھ کو زیرِ حراست رکھ لیا۔

عدمؔ صاحب کو ہسپتال میں جب ہوش آیا تو سکھ عدمؔ صاحب کے پاؤں پر تھا۔ عدمؔ صاحب نے صرف ایک سوال کیا: ''کیا خیال ہے خلوص ہے کہ نہیں؟'' سکھ نے عدمؔ صاحب کے خلوص کا کلمہ پڑھا اور اُس کی جان خلاصی ہوئی۔ پولیس سے اصرار کر کے عدمؔ صاحب اُسی سکھ کے ساتھ اُس کے گھر چلے گئے۔ (پولیس اِس دوستی پر حیران تھی) تھانیدار سرپنچ کے کہہ رہا تھا کہ سکھ پر اچھا خاصا پرچہ بن سکتا تھا جو برباد ہو گیا۔ خلوص کے امتحان میں پاس ہونے کی خوشی میں سردار جی نے عدمؔ صاحب کو دو عدد بوتل خالص ولایتی وِسکی کا تحفہ دیا۔

عدمؔ صاحب کا نیول اکاؤنٹس میں کراچی تبادلہ ہو گیا۔ جہاز پر گئے تو وہاں ڈیوٹی فری ہونے کی وجہ سے شراب سستی تھی۔ دو چار بوتلیں تحفتاً لیں اور Audit Objections کی فائل کو سمندر میں پھینک دیا۔ اوپر سے بازپُرس ہوئی فرمانے لگے: ''حضور! منوڑا جا رہے تھے، بادبانی کشتی تھی اُلٹ گئی۔ ہوا تیز تھی۔ خدا کا شکر کیا کہ مچھیروں نے جان بچائی۔ Objection کی فائل دوبارہ مرتب کر لیتے ہیں۔'' دوبارہ مرتب کس نے کرنا تھی؟ عدم صاحب کو فٹافٹ پنجاب تبدیل کر دیا گیا۔

جب پنڈی رہتے تھے تو ہمارے گھر سے دو فرلانگ پر دسہرہ گراؤنڈ میں مکان تھا۔ ہر روز ملاقات ہو جاتی تھی۔ اِس قربت کی وجہ سے مجھے اُن کے گھر کے حالات اور گزر اوقات کا پتہ چلا۔ تنخواہ کا بمشکل دسواں حصہ گھر دیتے۔ اکثر فاقوں کا عالم رہتا۔۔ ایک دن گھر میں فاقے کا عالم تھا۔ پڑوسیوں نے ترس کھا کر ایک سیر آٹا بھیج دیا۔ عدمؔ صاحب کو غصہ آ گیا۔ مجھے ساتھ لیا۔ آر۔اے بازار میں گندم کا سرکاری گودام تھا۔ انچارج حسین انور تھے۔ اُنھیں کہا: ''جتنی چاہے غزلیں سُن لو ایک بوری آٹا دے دو۔'' اُس نے تانگے میں تین بوری آٹا ہمراہ کر دیا۔ تین بوری آٹا تانگے میں رکھوا کر جب عدمؔ صاحب خود تانگے میں اگلی سیٹ ہر سوار ہوئے تو حسین انور نے عرض کیا: ''عدم صاحب! ایک عدد مزید بوری تانگے میں رکھوا دوں؟'' تو عدم صاحب نے جواب دیا: ''حضور! چوتھی بوری میں خود ہوں بے شک گھوڑے سے پوچھ لیجئے۔'' گھر آ کر ہمسایوں کو کہلوایا: ''کیا یاد کرو گے سیّد پر ترس کھایا ہے، ایک سیر کے بدلے ایک بوری آٹا لے لو۔''

محکمے والوں کو پتہ چلا تو ہر ماہ کی پہلی کو بیگم عدمؔ کو عدمؔ صاحب کی آدھی تنخواہ بھجوا دیتے۔ اِس پر عدمؔ صاحب خاصے جز بز ہو کر افسرانِ بالا سے کہتے: ''ایک تو شراب مہنگی ہو گئی ہے دوسرے آپ نے میری نیک کمائی آدھی کر دی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟'' بیگم عدمؔ نے اپنے بچوں کو اِتنی عمدگی سے پالا کہ ماشاءاللہ چاروں اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور اُن کی لاہور چھاؤنی میں ایک شاندار کوٹھی ہے۔

حسین انور کے گودام پر اکثر شعراء جمع رہتے۔ عدمؔ کا مجموعۂ کلام ''پیچ وخم'' نیا نیا چھپ کر آیا تھا۔ افضل پرویز وہاں لائے اور ہم سب پڑھ پڑھ کر مزے لینے لگے۔ منصور تابش کی زبان سے نکل گیا غزلیں تو خیر اچھی ہیں، یہ آزاد نظمیں بالکل بکواس ہیں۔ افضل پرویز ''پہلوان'' قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے منصور کو اِتنا پیٹا کہ اُس کی شعر فہمی کے سب ''پیچ وخم'' نکال دیے۔ یہ واقعہ صرف اِس لیے تحریر کر رہا ہوں تا کہ آپ کو پتہ چلے عدمؔ اُن دِنوں نوجوانوں میں کتنے مقبول تھے۔ منصور تابش کتنی دیر تک ٹکسالی اُردو میں ''ہائیں ہائیں'' کرتے رہے۔

ایک دن شراب لے کر میرے گھر تشریف لائے کہ یہیں پیوں گا۔ گھر والوں نے برتن دینے سے انکار کر دیا۔ بازار سے مٹی کا پیالہ لے آئے کہ خیام بھی تو مٹی کے برتنوں میں پیتا ہو گا۔

نئے خم اور پیمانے خریدے
مِری توبہ نے مے خانے خریدے
خرید اُس کی ہے جس نے مے کدے سے
تِری آنکھوں کے پیمانے خریدے

جب پی پلا چکے تو مٹی کا پیالہ ہوا میں اچھالتے ہوئے یہ شعر کہا:

ساغر اُچھال دو کہ ہو نغمہ کوئی بلند
گر مے نہیں بلا سے ، فضا کیوں خموش ہے

میری آپا جی جس جھاڑو سے ٹوٹے پیالے کے ٹکڑے صاف کر رہی تھیں اُسی سے مجھے پیٹ بھی رہی تھیں۔ جب میں نے اُنھیں بتایا کہ اِس پیالے کو ایک سیّدزادے کے ہونٹوں نے چھوا ہے تو

ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور نوکرانی سے کہا یہ ٹکڑے ڈھیر پر نہ پھینکنا بلکہ احترام سے مٹی میں دبا دینا۔

عدم صاحب کے تقریباً ۵۱ مطبوعہ دیوان ہیں۔ سوائے ''خرابات'' کے کوئی دیوان مستند دیوان نہیں کہا جاسکتا۔ چند نئی پرانی غزلیں اکٹھی کیں اور دیوان بنا کر بیچ دیا۔

جیب خالی ہے عدمؔ مے قرض پر ملتی نہیں
ایک دو بوتل پہ دیواں بیچنے والا ہوں میں

عدمؔ کے نقاد بھی عجب ہیں۔ کراچی میں عدمؔ غزل سُنا رہے تھے کہ ایک بزرگ شاعر بڑی سنجیدگی سے فرمانے لگے: ''عدم صاحب! الف ِگر رہا ہے۔'' عدمؔ صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: ''حضور! الف گرنے سے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی۔'' وہ صاحب فرمانے لگے ''نہیں۔'' عدمؔ صاحب نے فرمایا: ''تو اجازت دیجئے میں باقی غزل آپ کی خدمت میں عرض کروں۔''

عدمؔ کا تمسخر اُڑانے والوں نے ایک داستان گھڑ رکھی ہے کہ ایک دفعہ عدمؔ بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے پرہیز کے طور پر فرمایا کہ کوئی دماغی کام نہ کیجئے گا۔ غور و فکر ممنوع ہے۔ عدمؔ صاحب نے جواب دیا: ''میں شاعر ہوں، میرا تو کام ہی غور و فکر ہے۔ میں عبدالحمید عدم ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب پُر ذوق تھے، کہنے لگے: ''آپ کے کلام میں فکر کہاں؟ آپ شوق سے شاعری کریں۔''

عدمؔ صاحب کے آسان اشعار سے ہی نوجوانوں کا کچا ذہن نکھرتا ہے اور وہ اسی سیڑھی سے غالبؔ تک پہنچتے ہیں۔ غالب کی زمین میں بھی، اپنے رنگ میں عدمؔ، عدمؔ ہی رہتا ہے مثلاً:

مَے کدہ ہے ، یہاں سکون سے بیٹھ
کوئی آفت اِدھر نہیں آتی

جس دوست نے مجھے یہ طنزیہ لطیفہ سُنایا میں نے اُسے جواب دیا: ''یہ نہ کہو، عدمؔ ہی نے فرمایا ہے:

تُو مِری شاعری کی بات نہ کر
یہ ندی دو رُخوں سے بہتی ہے
ایک مصرع شعور لکھتا ہے
ایک مصرع شراب کہتی ہے

اِن عام فہم اشعار سے لوگوں کا ذوق نکھرتا ہے۔ اگر غالب نے کہا ہے:

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

تو عدمؔ صاحب نے اسی پایہ کا ایسا شعر کہا ہے:

پسِ پردہ بھی کچھ نہیں موجود
پردہ داری ہی پردہ داری ہے

جوش نے ثبوتِ حق کے لیے حضور پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی اور صبح کے منظر کا سہارا لیا ہے:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

عدمؔ نے ایک اِتنا عظیم شعر کہہ دیا کہ بڑے بڑے فلسفی انگشت بدنداں رہ گئے۔ دیکھیے کتنا آسان اور گہرا ہے:

آگہی میں اِک خلا موجود ہے
اِس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ مندرجہ بالا اشعار لکھ کر میرا مقصد عدمؔ کا غالب جیسے عظیم اور جوش جیسے بڑے شاعر سے تقابل مقصود نہیں۔ صرف یہ یاد دِہانی کرانا مدِّ نظر ہے کہ عدمؔ کے ۵۱ دیوانوں کا انتخاب فرما کر اگر عدمؔ کی روحانی اولاد جناب شوکت واسطی ایک انتخاب شائع کر دیں تو عدمؔ پر زمانے کی گرد نہیں بیٹھے گی اور اگر وہ غالب کی طرح عظیم نہیں تو جوش کی طرح ''بڑے شاعر'' (Major Poet)

بن کر جبینِ دوام پر دمکتے رہیں گے اور اُن کا یہ حق بھی ہے اور شوکت واسطی جیسے وفا شعار شاگرد کا فرض بھی ہے۔ اِس سلسلے میں اگر درکار ہو تو میں ہر قسم کے تعاون کے لیے حاضر ہوں۔

زندگی کی شاہراہ میں مَے کدے سے ہو کر نکل جانے والے عدؔم صاحب نے بھی آخر اپنی راہ بدل ڈالی۔ وہ بیٹا جو شراب کے ٹھیکے سے اُن کے لیے صبح کاذب سے پہلے ''پوا'' لایا کرتا تھا اُن کی آخری عمر میں رات سے صبح صادق کی نمو سے کہیں پیشتر نمازِ تہجّد کی ادائیگی کے لیے اُن کے واسطے برائے وضو پانی گرم کر کے لانے لگا تھا۔۔۔۔۔اللہ اللہ!!

میں نے عرض کیا تھا نا کہ وہ مردِ عجیب زندگی بھر اپنی الگ راہ بنا کر چلے اور اس کو انجام تک بھی جداگانہ روش سے پہنچایا۔

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں
اے عدؔم احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

قائم ہیں میکدے پر دو سرمدی لکیریں
اِک جام آ رہا ہے ، اِک جام جا رہا ہے

فقیروں کا جمگھٹ گھڑی دو گھڑی
شرابیں تِری ، بادہ خانے تِرے
بس اِک داغِ سجدہ مِری کائنات
جبینیں تِری ، آستانے تِرے
ضمیرِ صدف میں گُہر کا مقام
انوکھے ٹھکانے ترے

☆☆☆☆☆

ضمیمہ جات

اسرار زیدی

عدؔم کا آخری انٹرویو

سیّد عبدالحمید عدؔم کا یہ انٹرویو ٹیلی ویژن کے اربابِ اقتدار کے اصرار پر عدؔم کی موت سے کم وبیش ڈھائی ماہ قبل اُن کی قیام گاہ پر لیا گیا تاہم اس کے ٹیلی کاسٹ نہ ہونے میں جو مصلحت تھی اُس کا بہر حال مجھے علم نہیں۔ قدرے انتظار کے بعد میں نے یہ انٹرویو مکمل کر کے ایک مقامی ماہنامے میں شائع کرایا۔ اور عدم کی موت کے فوراً بعد کراچی کے ایک روزنامے نے اِس انٹرویو کو دوبارہ شائع کیا، اِس کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ عدؔم کا یہ آخری انٹرویو ہے چنانچہ اسے ایک امانت کے طور پر مِنّ وعن کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

یا زہر جبینوں سے ملاقات کریں گے
یا بندگیِ پیرِ خرابات کریں گے
آ اے دوراں ، درِ میخانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

عدم کے یہ اشعار اُن کے تخلیقی فن کے اجتماعی رویّے اور مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ یوں بھی یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ عدؔم کی شخصیت اُس مثلّث کا ایک واضح خط ہے جس کی تکمیل ریاض خیرآبادی اور جگر مرادآبادی کی شخصیات سے عبارت ہے اور یہ مثلّث اُس جمالیاتی طرزِ احساس کی نمائندہ ہے جس کے نقوش اُردو شاعری میں بہت گہرے ہیں، اِسی طرزِ احساس میں خمریات کی ایک رَو موجود ہے اور اِسی حوالے سے یہاں بات کو ریاض خیرآبادی، جگر مرادآباد اور عبدالحمید عدؔم تک محدود رکھا گیا ہے ورنہ جہاں تک اُردو شاعری میں جمالیاتی طرزِ احساس کا تعلّق ہے اختر شیرانی اور اُن کے

بعد آنے والی نسلوں کے درجنوں شاعر ایسے ہیں جو اِسی طرزِ احساس کو اپنے فن کی بنیاد بنائے ہوئے ہیں سو جب یہ کہا جاتا ہے کہ عدؔم الہام کو شراب میں ڈبو کر شعر کی تخلیق کرتا ہے تو یہ بات سو فیصد درست ہے۔ یہ رائے حقیقی اور واقعاتی صورتِ حال کی آئینہ دار ہے محض مفروضہ نہیں چنانچہ اِس وقیع رائے کو بنیاد بنا کر جب ہم گزشتہ 50 سے 60 سال تک کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں یہی تین شعراء سرِ فہرست نظر آئیں گے جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔ خمریات کا مسئلہ اِن تینوں بڑے اور صاحبِ طرز شعراء کے ہاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے تاہم عدؔم کی شاعری میں ایک رویّہ اور بھی ہے جو اُن کی پہچان کا سبب تو نہیں کہ پہچان تو اُن کی خمریات ہی کے حوالے سے ہوگی۔ تاہم ایک باشعور فن کار کی حیثیت سے ان کے بعد کی شاعری میں اپنے گرد و پیش کے مسائل کا جو اِدراک ملتا ہے وہ ان کے اس رویّے پر دلالت کرتا ہے کہ زندگی محض جمالیات تک ہی محدود نہیں بلکہ ۔

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سِوا

سو بات کہنے کی بس اِتنی ہی ہے کہ بنیادی طور پر عدؔم کا تعلق اس قبیلے سے ہے جو ریاض خیر آبادی، جگر مراد آبادی اور اختر شیرانی اور اِس قبیل کے کچھ اور رومانوی شعراء کا قبیلہ ہے۔

ایک عرصے تک اِس قبیلے کی ہماری اپنی اُردو شاعری پر حکمرانی رہی ہے لیکن عدؔم کی شاعری میں رومانیت کے علاوہ ایک اور رَو بھی ہے جو گزشتہ آٹھ دس سال سے ان کے ہاں در آئی ہے اور یہ خالصاً اس احساس کی رَو ہے جس نے گرد و پیش کے تلخ اور ناہموار عوامل سے جنم لیا ہے۔ فرق بس اِسی قدر ہے کہ ریاض خیر آبادی اور اُن کے قبیلے کے دوسرے شعراء کے زمانے میں یہ عوامل کسی حد تک موجود تو رہے ہیں پر ان کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ اُن کے عہد میں ایک ایسی نفسیاتی فضا موجود تھی جس کے سبب ان عوامل کا احساس کمتر بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ گزشتہ آٹھ دس سال میں عدؔم کے شاعرانہ رویّے میں جو تبدیلی آئی ہے وہ ایک طرح سے واضح ردِّ عمل کی آئینہ دار ہے اور مذکورہ عوامل کی شدّت کے سبب اس ردِ عمل کا وجود میں آنا ناگزیر تھا۔ عدؔم جیسا حسّاس شاعر بھلا اس ردِّ عمل سے خود کو کیسے بچا سکتا تھا؟ چنانچہ اُن کی ان دِنوں کی تخلیقات اپنے رویّے کے اعتبار سے اُن کی باقی شاعری سے

یقیناً مختلف نظر آتی ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس سال کے عرصے میں اُنھیں یکے بعد دیگرے کئی ذہنی دھچکے لگے۔ کچھ محرومیاں، کچھ پابندیاں اور کچھ یاسیتوں نے مل کر عدؔم پر جو یلغار کی اُس کے سبب وہ ایک ایسی جہت سے آشنا ہوئے جس کا اِدراک تو اُنھیں پہلے بھی تھا لیکن اپنی اُفتادِ طبع کے سبب اُنھوں نے اِسے کسی مرحلے پر بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ پر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں یہ احساس اور قوی ہوتا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی جمالیات اور خمریات تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور کچھ بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اب شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ماضی کی شاعری کو یکسر رد تو نہیں کرتے پھر بھی ان کے ذکر سے ان کے ہاں گریز کی کیفیت نظر آتی ہے۔

سیّد عبدالحمید عدم اس وقت 72 کے پیٹے میں ہیں۔ صحت بھی کچھ بُری نہیں کہ اُن سے ملاقات کے دوران ایسے احباب کو جو اُن کے بہت قریب رہے ہیں اپنی شناخت کرانی پڑتی ہے۔ چند ماہ قبل قتیل شفائی، موجد اور مرتضیٰ برلاس اُن سے مل کر آئے اور اُنھوں نے اِس امر کا انکشاف کیا تو یہ انکشاف نہ صرف حیرت کا باعث تھا بلکہ ایک دُکھ کا سبب بھی، کہ لمحے دوستوں میں گھرا رہنے والا عدؔم اب اُن کو پہچاننے سے بھی معذور ہو چکا ہے۔ رفیقِ حیات کی موت نے عدؔم سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے جو اُن کا طرّۂ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب شعر گوئی اور اس کے بارے میں گفتگو سے بھی گریزاں نظر آتے ہیں۔ تن بدن کا ہوش تو اُنھیں پہلے بھی نہ رہتا تھا لیکن یہ صورت محض مخصوص کیفیات تک محدود رہتی تھی پر اب تو عدؔم سے ملاقات کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیت اُن پر مستقل طور پر مسلّط ہو گئی ہے۔ پہلے جب بولنے پر آتے تھے تو مسلسل بولے چلے جاتے تھے۔ شعر سنانے میں بھی اُن کا رویّہ یہی ہوتا تھا لیکن اب نہ صرف وہ گفتگو سے گریز کرتے ہیں بلکہ شعر سُنانے کی خواہش پر تو اُن کا لہجہ خاصا تلخ ہو جاتا ہے۔

عدؔم سے میرے تعلقات کی عمر کم و بیش بیس بائیس سال ہے اور اِس مُدّت میں آٹھ نو سال تو اِس طرح گزرے ہیں کہ بسا اوقات 24 گھنٹے ساتھ رہا ہے۔ عدؔم کے اور میرے درمیان تعلقات کے سلسلے میں باہمی احترام کا ہمیشہ ایک خاموش سمجھوتہ رہا ہے ورنہ اپنی مخصوص کیفیت میں تو وہ کسی کو بھی

بخشنے کے قائل نہ تھے۔ عدؔم کے ہم مشرب احباب (جن سے مجھے بھی دوستی کا فخر حاصل ہے) اکثر اِس صورتِ حال پر حیران و پریشان رہتے تھے کہ اپنی مخصوص کیفیت کے دوران بھی عدؔم نے مجھ سے کبھی ایسا رویّہ نہیں برتا جو ہمارے اِس خاموش سمجھوتے سے متصادم ہوتا۔ ان دوستوں نے بعض اوقات عدؔم سے اِس کا اِظہار بھی کیا۔ لیکن عدم کا جواب اُن کو خاموش کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

بہر کیف بیس بائیس برس کا عرصہ اِتنا ہوتا ہے کہ میں بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں نے عدؔم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اِس عرصے میں جو ملاقاتیں رہیں اُن سے اتنی یادیں وابستہ ہیں جن کے بارے میں بس اِتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ؎

سفینہ چاہیے اِس بحرِ بے کراں کے لیے

یہ یادیں میرے سینے میں محفوظ ہیں اور کبھی موقع ملا تو ان کا ذکر کروں گا۔ فی الحال تو ایک انٹرویو کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

عدؔم اِن دِنوں جن کیفیات سے دوچار ہیں اُن کا ذکر اشارتاً سطورِ بالا میں کیا جاچکا ہے، اِس صورتِ حال میں اُن سے کسی قسم کا باضابطہ انٹرویو جس قدر مشکل ہوا اس کا اندازہ بھی شاید اُتنا ہی مشکل ہو مگر ٹیلی ویژن والے اِس امر پر مصر تھے کہ یہ انٹرویو ضرور ہونا چاہیے اور عدؔم تھے کہ پُٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتے تھے۔ انٹرویو تو الگ رہا، وہ اپنی شاعری اور شب و روز کے بارے میں اِس کے علاوہ کچھ کہنے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے کہ:

''بیوی کے انتقال نے میری تمام صلاحیتیں سلب کر لی ہیں اور اعصاب کو اِس شدّت کے ساتھ متأثر کیا ہے کہ میں اِس موضوع پر کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔''

جب رویّہ یہ ہو تو اِس امر کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ انٹرویو کا معاملہ کس قدر کٹھن ہو جاتا ہے بہر حال سرور مجاز کی آمد سے یہ مرحلہ کچھ آسان ہوگیا، پھر بھی میں نے متعلقہ ارکان کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنا کیمرہ اور دوسرا ساز و سامان تیار رکھیں اور میری جانب سے اشارہ ملتے ہی اپنی کارروائی شروع کردیں چنانچہ نصف گھنٹے کی 'ہوں ہاں' کے بعد عدؔم کچھ موم ہوئے۔ مجھے یہ دعویٰ تو نہیں لیکن عدؔم

کے ساتھ طویل رفاقت کی بِناء پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ ہوں۔ چنانچہ کیمرہ مین کو اشارہ کرتے ہوئے عدؔم سے باقاعدہ گفتگو کا آغاز ایک ایسے نازک اور حسّاس سوال سے کیا جس کے علاوہ ان دِنوں وہ کسی موضوع پر بات کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ مجھے اِس امر کا پوری طرح علم ہے کہ یہ عدؔم کی بیوی ہی تھیں جو کم و بیش نصف صدی تک عدؔم جیسے آدمی سے نباہ کر سکیں۔ گھر کی ذمہ داریاں، اولاد کی پرورش حتیٰ کہ خود عدؔم کی دیکھ بھال جس طرح اُنھوں نے کی وہ اُنھی کا حصّہ ہے۔

عدم قریب قریب ہر روز مدہوشی کے عالم میں نصف شب کے بعد گھر پہنچتے بلکہ پہنچائے جاتے تھے اور یہ اُن کی مرحومہ بیگم تھیں جو اِس کیفیت میں نہ صرف یہ کہ اُن کی مناسب دیکھ بھال کرتیں بلکہ اس کے بعد عدؔم کی غذا اور لباس کا بھی پوری طرح خیال رکھتی تھیں۔ بہر حال میں نے عدؔم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''آپ کی بیگم کی وفات یقیناً بہت بڑا سانحہ ہے تاہم آپ یہ تو بتا سکیں گے کہ اُن کی طویل رفاقت کا آپ کی تمام زندگی، خصوصیت سے شاعری پر کیا اثر پڑا؟''

''یہ سوال قدرے جذبات سے بھی تعلق رکھتا ہے تاہم اِس کا عملی زندگی سے گہرا تعلق ہے، بس یوں سمجھ لیں کہ میری بیوی میرے لیے بہت کچھ تھیں۔ وہ ایک مکمل رفیقۂ حیات تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی صحیح بنیاد پر پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کا ایسا کارنامہ ہے جس کے بغیر میں اپنی تخلیقی زندگی کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا۔ بِالفاظِ دیگر اگر وہ اِن ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتیں تو میرے لیے سکون کا ایک لمحہ بھی ممکن نہ تھا، شعر گوئی تو الگ بات ہے۔ اِس اعتبار سے میری شاعری کا بیشتر حصہ میری بیوی کے تعاون کا مرہونِ منت ہے۔''

''عدم صاحب آپ اِتنے بڑے شاعر ہیں اور درجنوں کتابوں کے مصنّف بھی .... یہ صورتِ حال کس حد تک آپ کی اولاد پر بھی اثر انداز ہوئی ہوگی؟''

''گھریلو مسائل سے کسی حد تک لاتعلقی کے باوجود میں نے اِس امر کا پوری طرح خیال رکھا

کہ میری اولاد شاعری کی بجائے عملی زندگی کے لیے تیار ہو اور خدا کا شکر ہے کہ میرے بیٹے بیٹیاں عملی زندگی میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔اب اگر وہ شاعری میں دلچسپی لیں تو میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوگی۔"

میں نے سوال کیا:

"آپ کی پوری شاعری میں جمالیات اور خمریات کے موضوعات کا بڑی حد تک عمل دخل نظر آتا ہے، ایسا تو نہیں کہ آپ نے پوری زندگی کو اِنھی حوالوں سے دیکھا ہے؟"

"یہ غلط ہے" عدم صاحب اس مرحلے پر ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑتے ہوئے نظر آئے۔

میں نے اپنے سوال کو مختصر کرتے ہوئے استفسار کیا:

"پھر بھی جمالیت تو آپ کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔"

"یہ کسی حد تک درست ہے۔ میں نے اپنے گرد و پیش کا بھی اِسی حوالے سے جائزہ لیا ہے حتیٰ کہ خدا کے بارے میں بھی میرا تصوّر واضح ہے۔مثال کے طور پر:

اِنکار کس کا کرتے ہو تم وہ اگر نہیں
انکار جس کا کرتے ہو تم، وہ خدا تو ہے

اس کے بعد میں نے کہا:

دُنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا

اور آخری بات یہ کہ:

نہیں ہو تو نہ ہو میری بلا سے
مجھے محسوس ہوتا ہے ...... خدا ہے

تینوں اشعار میں بالخصوص مؤخرالذّکر شعر میں عرفان کی جو منزل ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے ہاں مل سکے گی؟ .... اِس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔"

''عدؔم صاحب! ذرا اِس مسئلے پر بھی روشنی ڈالیے کہ آپ کے کسی پیش رو یا ہم عصر شاعر نے کسی مرحلے پر آپ کو متاثر کیا ہے، میری مراد یہ ہے کہ کسی دوسرے شاعر کی تخلیقات آپ کے فن پر اثر انداز ہوئی ہیں؟''

''اِس کا جواب میری جانب سے قطعی نفی میں ملے گا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرا اپنا ہے، کسی سے مستعار نہیں۔''

''لیکن دوسرے کلاسیکی شعراء سے قطع نظر شعراء کی ایک بڑی تعداد مثلاً اختر شیرانی، ریاض خیرآبادی اور جگر مرادآبادی وغیرہ، یہ سب جمالیاتی رویّوں پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں یہ رویہ بڑی حد تک موجود ہے؟'' میرا اگلا سوال تھا۔

''آپ نے جمالیاتی رویوں سے جن شعراء کا حوالہ دیا ہے، میرا فن کسی حد تک اُن سے مختلف ہے۔ ان شعراء نے جمالیات ہی کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے جب کہ میں نے اِس حوالے سے اپنے ِگرد و پیش پر بھی پوری نظر رکھی ہے۔''

''اچھا تو 'جدید شاعری' خصوصیت کے ساتھ جدید غزل کے بارے میں آپ کے تأثرات کیا ہیں؟''

''یہ سب بکواس ہے۔ مجھے کسی جدید شاعری نے متأثر نہیں کیا۔ جِدت کے نام پر قطعاً لایعنی قسم کی شاعری ہو رہی ہے۔''

''اِس کا مطلب یہ ہوا کہ عصری تخلیق کے عمل کو آپ محض اپنی ذات تک محدود کر رہے ہیں۔ آپ اپنے بعد کی شاعری کی نفی کرتے ہیں؟''

''بے شک اسی طرح سمجھ لیجئے۔ میں جدید غزل سے قطعاً مطمئن نہیں ہوں۔''

''مگر آپ کے رویّے پر اکتفا کیا جائے تو تخلیقی عمل میں ارتقاء کے مسئلے سے دستبردار ہونا ہو گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آنے والی ہر نسل اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں فن کو آگے بڑھاتی ہے؟''

''ممکن ہے آپ کی بات درست ہو مگر میں اِس رائے پر قائم ہوں کہ نئی نسل نے کم از کم غزل کی حد تک اِس صنف کو کچھ نہیں دیا اور میرے نزدیک یہ ایک بڑا المیہ ہے۔''

''عدم صاحب! ایک سوال اور، جو میرے نزدیک خاصا اہم ہے کہ 'خرابات' غالباً آپ کا اوّلین مجموعہ ہے۔ اس کے بعد سے اب تک آپ کے دو درجن سے زائد مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں لیکن نقادانِ فن کے علاوہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ آپ کی دیگر تصانیف 'خرابات' سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ بالفاظِ دیگر، 'خرابات' آپ کا سب سے معیاری اور نمائندہ مجموعہ ہے۔''

''میں اِس نظریے کو قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ 'خرابات' کی طرح میرے دوسرے مجموعے بھی معیار کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔ لوگ اگر خواہ مخواہ تعصّبات کا شکار ہو جائیں تو اِس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟''

''یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے عہد میں مصنّف اور ناشر کے مابین جو رشتہ ہے وہ بڑی حد تک اطمینان بخش نہیں پھر بھی اِس سلسلے میں آپ کے خیالات جاننا ضروری ہیں۔''

''صاحب! بات یہ ہے کہ مجھے دوسروں کا علم نہیں۔ پر میرے ناشرین نے مجھ سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ کچھ میری اپنی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا گیا اور کچھ میری دوسروں پر اعتماد کرنے کی عادت سے بھی .... اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ناشر حضرات نے قدم قدم پر میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ معاوضہ تو الگ رہا، مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ کس کس نے میری تصنیفات کو شائع کیا ہے، اِسی لیے تو میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اب تک میرے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''

''یہ فرمایئے کہ ہمارے ہاں مشاعرے کی جو اہمیت ہے اُس کے بارے میں آپ کے تأثرات کیا ہیں؟''

''مشاعرہ بلاشبہ ہماری ایک تہذیبی روایت ہے۔ اس سے شعر کہنے کی تحریک ہوتی ہے۔ میرے نزدیک مشاعرہ ایک ایسا انسٹی ٹیوشن ہے، جسے بہر حال جاری و ساری رہنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ شعراء کو باہمی طور پر یکجا ہونے اور مل بیٹھنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں بلکہ باذوق سامعین

کو بھی ایک ہی مرحلے پر بہت سے شعراء کا کلام سُننے کا وسیلہ میسّر آتا ہے۔ پھر یہ کہ شعراء اور سامعین کے مابین مشاعرہ رابطے کا بے حد اہم ذریعہ بنتا ہے۔ اِس روایت کو بہرحال زندہ رہنا چاہیے۔'' یہ مختصر انٹرویو تو تمام ہوا تاہم آخر میں اِس امر کا ذکر کرنا ناگزیر ہوگا کہ عدمؔ اب عمر کے اس مرحلے میں ہیں جہاں ان کی جسمانی صحت کے ساتھ ذہنی صحت بھی انحطاط پذیر ہے اور اطمینان بخش نہیں۔ یہ اگرچہ بہت تلخ حقیقت ہے پر اس کو قبول کرنا ہی پڑے گا کہ نہ چاہنے کے باوجود یہی ناقابلِ تردید سچائی ہے وہ اب ان حقیقتوں سے محروم ہو چکے ہیں، جو ایک عرصے سے اُن کے جسم و رُوح میں رچی بسی تھیں۔ اپنی رفیقۂ حیات کی موت نے اُن کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے اور شراب تو اب واقعی ان پر حرام ہو چکی ہے۔ اب تو وہ اپنی شاعری کے ذکر سے بھی گریز کرتے ہیں جس میں اس ''مئے اندوہ رُبا'' کا ذکر اِشارتاً بھی آیا ہے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے حقیقی معنوں میں ایک سچا فن کار اپنی عمر بھر کی دولت سے یوں گریزاں ہو کر یکسر اُسے مسترد کرنے پر آمادہ نظر آئے، پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی فن کار کی تخلیقات محض اُس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ یہ ایک ایسا رویہ ہے جس سے اُس کے ہم عصر اور بعد کی نسلیں استفادہ کرنے کا حق رکھتی ہیں اور اِس کلیے سے بہرحال عدمؔ کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

اسرار زیدی

موت برحق ہے مگر!

خود اُس کے گھر کی ہی دیوار ،گر پڑی اُس پر
یہ آج دفن ہُوا ہے ، مَرا تو کب کا تھا

آج منگل کا دن ہے اور مارچ کی دس تاریخ!

قریب قریب دو بجے ڈاک سے 'اخبارِ جہاں' ملا ہے۔ سرِ ورق کی پُشت پر رضی اختر شوق کی چار اشعار پر مشتمل ایک مختصر نظم کتبہ کے عُنوان سے درج ہے جس کا چوتھا اور آخری شعر وہی ہے جو اُوپر درج کیا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں رضی اختر شوق نے یہ کس کا کتبہ لکھا ہے؟ اِن اشعار میں جو شدید قسم کا تأثر موجود ہے وہ یقیناً کوئی الم ناک پس منظر لیے ہوئے ہے۔

مجھے قتیل شفائی سے ایک ضروری کام سے ملنے سمن آباد جانا ہے اِس لیے 'اخبارِ جہاں' پر سرسری نظر ڈال کر رکھ دیتا ہوں لیکن دل میں کچھ اضطراب سا لیے غالب کالونی سمن آباد پہنچ جاتا ہوں۔ بھابھی سے اطلاع ملتی ہے کہ قتیل انارکلی گئے ہیں شاید مجھ سے ملنے کے لیے! نوید مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے بتاتا ہے:

''جوش صاحب کا انتقال ہو گیا۔'' جوش صاحب کا؟ میں گھبراہٹ میں گلاس میز پر رکھ دیتا ہوں۔ جی ہاں! ابّا جی کے جانے کے بعد ندیم صاحب کا فون آیا تھا۔ کہتے تھے چار بجے جنازہ اُٹھے گا۔

میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہو جاتا ہوں اور قتیل صاحب کے لیے نوید کو پیغام دے کر واپس گھر چلا آتا ہوں۔ دل بے حد افسردہ ہے۔

شام کو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے پاک ٹی ہاؤس جاتا ہوں۔ باہر اجمل نیازی، ستار سیّد اور آذر تمنّا کچھ اُداس کھڑے ہیں۔

''کیا عدؔم کے جنازے میں گئے تھے؟'' تینوں میں سے ایک پوچھتا ہے۔

''کیا مطلب! میں نے تو جوش صاحب کے بارے میں سُنا ہے۔'' میں جواب دیتا ہوں۔

''کیا جوش صاحب بھی؟'' آذر تمنّا قریب قریب چیخ کر کہتا ہے۔

اب میری سمجھ میں سارا معاملہ آ چکا ہے۔ ندیم صاب کا فون بھابی نے سُنا تھا۔ اُنھیں نہ جانے عدؔم کی بجائے جوش صاحب کا خیال کیسے آ گیا۔

خدا جوش صاحب کو زندہ سلامت رکھے۔ میرے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ لیکن عدؔم یوں اچانک راہیٔ مُلکِ عدم ہو جائے گا یہ اطلاع قطعاً غیر متوقع تھی۔

میں دوستوں کے ہمراہ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر اپنی سوچ میں گم ہو جاتا ہوں۔ ''تو کیا رضی اختر شوق عدؔم کی موت کا علم پہلے ہی ہو گیا تھا؟''

''نہیں یہ کتبہ تو عدم کا بھی ہو سکتا ہے، مجاز کا بھی اور اختر شیرانی، منٹو، ساغر صدیقی اور نہ جانے کس کس کا۔''

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کی اشاعت عدؔم کی وفات کے موقع پر ہوئی ہے اور یوں اس کی اہمیت میرے لیے دوچند ہو گئی ہے۔

اب ڈھونڈیئے تو اُس کا نشاں بھی نہ پایئے
وہ موج جو سفینۂ دل کو ڈبو گئی

عدؔم کی موت نے پورے ماحول کو سوگوار کر دیا ہے۔ کیا باغ و بہار شخص تھا۔ سیّد عبدالحمید عدؔم کی شاعرانہ حیثیت میں تو کلام کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس کی شخصیت بھی ایسی رنگا رنگ تھی کہ ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کی ہوس ہوتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عدؔم سے میرا تعارف پہلی بار 48ء میں آج سے کم و بیش 31 سال پہلے ملتان کے ایک مشاعرے میں ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی ملاقات محض مشاعروں تک محدود رہی لیکن جب میں ساہیوال چھوڑ کر 58ء میں مستقل طور پر لاہور اُٹھ آیا اور پھر یعسوب الحسن (مرحوم) کے دفتر میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو عدؔم سے قریب قریب ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ یعسوب الحسن

''نیرنگِ خیال'' والے حکیم یوسف حسن (مرحوم) کے برادرِ خورد تھے اور اپنے دفتر واقع فلیمنگ روڈ سے ایک جنسی ماہنامہ ''خضرِ راہ'' نکالتے تھے۔ ''خضرِ راہ'' کیسے مرتب ہوتا اور کس طرح شائع ہوتا یہ تو ایک طویل داستان ہے۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ''خضرِ راہ'' کا دفتر بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی پناہ گا تھا۔ بالخصوص ایسے شاعر اور ادیبوں کی جو باقاعدگی کے ساتھ قریب قریب ہر روز پینے پلانے کے لیے آتے تھے۔

ان اہلِ قلم میں خصوصیت کے ساتھ ظہیر کاشمیری، شاد امرتسری، منیر نیازی، محمود اختر کیانی، خیال امروہوی، قمر صدیقی کے علاوہ بہت سے لوگ روز مرہ دفتر میں حاضری دینے والوں میں سے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ عدمؔ نے بھی کسی دن ناغہ کیا ہو۔ بہر حال یہاں ''خضرِ راہ'' کے دفتر کی سرگرمیوں کا ذکر مقصود نہیں۔ کہنا صرف اِسی قدر ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب متضاد دلچسپیوں کے باوجود ہم ایک دوسرے کے قریب ہوئے اِس لیے کہ عدمؔ ''ہم نوالہ'' تو بہت کم ہوتے تھے اور اسے میری بے تعلقی سمجھیئے کہ اُن کا ہم پیالہ کبھی نہ بن سکا۔

یوں عدمؔ سے میرے تعلقات کی عمر نو خاصی طویل ہے لیکن ''خضرِ راہ'' کے دفتر کے توسط سے کم و بیش چھ سات سال سے بھی زیادہ کا عرصہ اِس طرح گزرا ہے کہ اکثر شب و روز ہم نشینی رہی ورنہ چوبیس گھنٹے میں کم از کم آٹھ دس گھنٹے تو ضرور ایسے ہوتے تھے جب عدمؔ اور دوسرے احباب یقیناً یکجا ہوتے تھے۔

ان ایّام میں بہت کچھ ہوا۔ بے شمار قابلِ ذکر واقعات رُونما ہوئے، اُن کی تفصیلات کے لیے اِتنا کہوں گا کہ ؎

سفینہ چاہیے اِس بحرِ بے کراں کے لیے

عدمؔ بے حد زُود نویس شاعر تھا۔ اُس کے تقریباً دو درجن شعری مجموعے ہمارے سامنے موجود ہیں اور شاید چند مطبوعے غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ وہ ایک وسیع تر شعری کائنات کے حوالے سے دیکھا جاسکتا ہے تاہم سہلِ ممتنع اُس کی شاعری کا وہ بنیادی عنصر ہے جس کے باعث وہ کسی بھی دوسرے شاعر سے علیحدہ اور منفرد نظر آتا ہے۔

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جُرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

اے عدم ! احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

آ گہی میں اِک خلا موجود ہے
اِس کا مطلب ہے، خدا موجود ہے

عدؔم کی بیشتر شاعری کسی نہ کسی پس منظر کی شاعری ہے۔ اِس پس منظر کو اُس نے اپنے جمالیاتی پیرایۂ اِظہار کی بِنا پر ایک کیفیت اور تأثر بخشا ہے جو قاری یا سامع کے دل کی گہرائیوں میں اُتر اُتر جاتا ہے۔ اِس ضمن میں ایک واقعہ خود عدؔم کی زبان سے سُنیئے۔ اِس واقعہ کی بنیاد عدؔم کا ایک خوب صورت قطعہ ہے جس کا ایک خاص پس منظر ہے:۔

مندر کو جا رہی ہے وہ اِک طشتری لیے
اور طشتری میں جلتے دیوں کی بہار ہے
اے پتھروں کو پوجنے والی حسیں کرن
رستے میں تیرا ایک عبادت گزار ہے

عدمؔ تقسیمِ ہند سے قبل اپنی ملازمت کے سلسلے میں غالباً متھرا میں تعیّنات رہے۔ متھرا اہلِ ہنود کا ایک متبرّک شہر ہے۔ عدمؔ علی الصبح روزمرّہ ایک خوب صورت ہندو دوشیزہ کو عبادت کے لیے دریا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ یہ دوشیزہ اُنھیں اچھی لگی۔ اپنی اُفتادِ طبع کے اعتبار سے وہ اُس کے خاموش پرستار تھے۔ تاہم جذبات کے مُنہ زور گھوڑے کو کون روک سکتا ہے، چنانچہ اپنے تاثرات کا اظہار اُنھوں نے اِس قطعہ میں کر دیا۔

عدمؔ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہزارہا ایسے واقعات ہیں جن کو یکجا کیا جانا چاہیے۔ وہ بے حد ذہین، حاضر جواب اور لطیفہ گو تھا۔ اُس کی خوب صورت باتیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اُس کا روزمرّہ کا کام تھا۔ یہ باتیں یقیناً ہمارے ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ اپنے فطری لااُبالی پن کے باعث وہ خود اِن باتوں کو یکجا نہ کر سکا، لیکن اُس کی باتیں، اُس کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ لیکن جس طرح عدمؔ شاعر کی حیثیت سے منفرد تھا، اسی طرح اپنی شخصیت میں بھی منفرد تھا۔ وہ شاعری میں جس روایت پر گامزن رہا، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ روایت اُس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اپنی مرنجان مرنج شخصیت کے باعث وہ ہر طبقہ میں ہردلعزیز تھا اور جس طرف سے بھی گزرتا لوگ محبت اور احترام کے ساتھ اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے۔ پولیس والے اُس کے دوست ہوتے ہیں لیکن عدمؔ کے احترام میں میں نے اُن کو بھی سر جھکاتے دیکھا ہے۔ اِس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

ہُوا یُوں کہ گرمیوں کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ ہم لوگ دفتر کے صحن میں کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ شغل جاری تھا اور اس کے ساتھ شعر و شاعری بھی! بالائی منزل پر دو صاحبزادیاں قلم اور کاپیاں لیے اشعار نقل کر رہی تھیں۔ محفل پورے شباب پر تھی۔ حاضرین میں ایک صاحب جو کبھی کبھی آیا کرتے تھے اور بہت جلد آپے سے باہر ہو کر گالی گلوچ پر اُتر آتے، وہ بھی موجود تھے۔ اُن کی نگاہ اُوپر اُٹھی اور ترنگ میں آ کر اُنھوں نے لڑکیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ہم نے اُن کو اِس حرکت سے منع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ تو اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ چند لمحوں بعد لڑکیاں یہاں سے چلی گئیں۔

بظاہر تو یہ بات ختم ہو گئی لیکن پندرہ بیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ سب لوگ

خاموش ہو گئے۔ میں ہی چونکہ ایک طرح سے بظاہر خشک تھا، اس لیے دروازے پر مجھے جانا پڑا۔ کُنڈی کھول کر دیکھا تو باہر ایک نوجوان اے ایس آئی دو باوردی سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے اس کی آمد کا مقصد پوچھا تو اے ایس آئی بولا:

''یہاں کچھ لوگ ہنگامہ کر رہے ہیں۔ ہمیں تھانے میں فون پر اطلاع دی گئی ہے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ایک رسالے کا دفتر ہے اور اندر چند شعراء بیٹھے ایک دوسرے کو اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اے ایس آئی نے ایک لمحے میرے سراپا کا جائزہ لیا پھر معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا:

''رپورٹ درج ہو چکی ہے، میں اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہوں۔ آپ لوگوں کو تھانے ضرور چلنا پڑے گا۔

یہ مکالمہ جاری تھا کہ ہر رِندِ بلانوش دروازے پر پہنچ گیا اور اُن میں عدمؔ سب سے آگے تھا۔

''تھانیدار صاحب! ہم آپ کے ساتھ ضرور چلیں گے۔'' یہ عدمؔ کی آواز تھی۔

چنانچہ دو تانگے منگوائے گئے۔ ''خضرِ راہ'' کا دفتر بازار میں تھا۔ سب دکاندار اپنے مقام پر حیرت زدہ کھڑے ہوئے تھے اور شعراء کا یہ جلوس پولیس کی سرکردگی میں بڑی شان وشوکت سے روانہ ہو گیا۔ تھانے میں داخل ہوئے تو ایک سب انسپکٹر اپنی روایتی رعونت کے کے ساتھ کرسی پر بیٹھا شاید ہمارا منتظر تھا لیکن عدمؔ اور دوسرے شعراء کو دیکھتے ہی وہ ہماری جانب لپکا۔ پھر اے ایس آئی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''اِنھیں کس نے لانے کو کہا تھا؟''

اے ایس آئی بے چارہ کھسیانہ ہو گیا۔ وہ صورتِ حال کو بھانپ چکا تھا اِس لیے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ ادھر انسپکٹر ایک ایک ملزم سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ چند لمحوں میں کرسیاں آ گئیں اور سب انسپکٹر کے حکم پر بے پناہ خاطر و مدارت کی گئی۔ مٹھائی، چائے اور شاعر کے پسندیدہ سگریٹ! اس کے بعد معذرت ہی معذرت۔ پھر دو تانگے منگوائے گئے اور یہ قافلہ بڑے عزّ و احتشام سے واپس ''خضرِ راہ'' کے دفتر پہنچ گیا۔ بازار والوں پر اِس واقعے کا بڑا رعب پڑا۔ اس کے بعد عدمؔ ایک عرصے تک

متعلقہ سب انسپکٹر سے ضرورت مندوں کی سفارش کرتا رہا۔

واقعات ایک نہیں، بے شمار ہیں۔کس کس کا ذکر کیا جائے؟ پھر یہاں موقع محل بھی نہیں ہے البتہ عدؔم سے آخری ملاقات کا ذکر ضرور کروں گا۔

یہ کم و بیش ڈھائی تین ماہ قبل کی بات ہے، عدم سے ملے کئی ماہ ہو چکے تھے۔عدؔم نے خود بھی گھر کو ہی گوشۂ عافیت سمجھ لیا تھا۔ پینے پلانے کا سلسلہ بھی غالباً ختم تھا۔ پھر یوں ہوا کہ قتیل شفائی، مرتضیٰ برلاس اور موجد عدؔم سے ملنے گئے تو وہ اُنھیں نہ پہچان سکا۔ بینائی خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ جب قتیل نے بتایا تو پتہ چلا۔ پھر یوں ہوا کہ ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر میرے ہاں آئے اور بتایا کہ عدؔم کا انٹرویو کرنا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر اِتنا کہنا کافی ہے کہ عدؔم کے ہاں یہ انٹرویو ہوا۔ اُن کے صاحبزادے اور دیگر اہلِ خانہ بھی موجود تھے۔عدؔم نے مجھے بھی اُس وقت پہچانا جب اُنھیں بتایا گیا لیکن وہ انٹرویو کے لیے آمادہ نہ تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی بینائی میں کمی تو خیر پہلے ہی ہو گئی تھی، عدؔم کی آواز بھی قدرے بیٹھ گئی تھی۔ نصف گھنٹے تک میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور وہ 'ہوں ہاں' کے علاوہ بیشتر وقت خاموش رہا۔ بیوی کی موت کا اُس پر بڑا شدید اثر تھا۔ خدا خدا کر کے عدؔم کو انٹرویو پر آمادہ کیا لیکن جب میں نے یہ شعر پڑھا:

آ اے غمِ دوراں ! درِ مے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے

تو حضرت بِدک گئے۔ کہا: ''بکواس ہے، یہ سب بکواس ہے۔'' میں نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: ''عدؔم صاحب آپ کی بیشتر شاعری میں تو یہی سب کچھ ہے، اِسے بکواس کس طرح کہتے ہیں؟''

یوں سمجھ لیجئے کہ میں عدؔم کا تھوڑا سا نبض شناس بھی رہا ہوں اسلیے ساری صورتِ حال کے پیشِ نظر موضوع بدلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ پھر یہ انٹرویو ہوا۔ سرور مجاز بھی موجود تھے۔ چنانچہ کم از کم پچیس منٹ تک عدؔم سے باتیں ہوئیں، ضروری، کچھ غیر ضروری!

اس انٹرویو کا کیا بنا؟ یہ تو ٹی وی والے ہی بہت سمجھ سکتے ہیں۔

اِن اشعار میں عرفان کی جو فضا نظر آتی ہے اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی جبلت میں تضاد بھی موجود ہے۔ عدؔم کے حوالے سے اِس تضاد کا اِظہار ایک واقعہ سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ قتیل شفائی مرحوم سے ایک محفل میں سُنا۔

قتیل نے بتایا کہ ''خضرِ راہ'' کے دفتر میں جانے سے قبل عدؔم اور الطافؔ مشہدی کا معمول تھا کہ نئی انارکلی میں ممتاز ہوٹل کے بالا خانہ پر ہر شام اپنے شغل میں مصروف رہتے تھے۔ ترنگ میں آتے تو ایک دوسرے کو اپنے تازہ شعر سُناتے۔ ایک شام الطاف مشہدی نے تازہ غزل سُنائی جس کا اِک مصرعہ تھا:

پتّا بھی نہیں ہلتا بغیر اُس کی رضا کے

عدؔم فوراً اٹھتے سے اُکھڑ گئے، بولے ''ہلتا ہے۔''

الطاف مشہدی کیسے ہار مانتے؟ کہنے لگے: ''نہیں ہلتا۔'' ایک بار دونوں جانب سے ''ہلتا ہے، نہیں ہلتا'' کی تکرار ہوئی۔

عدؔم صاحب کو جو تاؤ آیا تو اپنے مؤقف کا وِرد کرتے ہوئے بالا خانے سے نیچے چھلانگ لگا دی اور اپنے بھاری بھرکم وجود کے باوجود بالکونی میں جا اٹکے۔ بازار میں بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ بہ مشکل موصوف کو بالکونی سے اُتارا۔ شکر ہے کہ ہڈی پسلی محفوظ رہی۔ بقائمِ ہوش وحواس فرمانے لگے: ''کوئی گل نہیں، میرا پیر سلپ کر گیا تھا۔

(یہ انٹرویو تفصیلی طور پر میرے دوسرے مضمون ''عدم کا آخری انٹرویو'' میں موجود ہے،)

شورش کاشمیری

عبدالحمید عدمؔ

پاکستان سے پہلے لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ صدر غالباً سر عبدالقادر تھے۔ مشاعرہ گویّوں کے ہاتھ میں رہا۔ اختؔر شیرانی مشاعرے کے شاعر ہی نہ تھے۔ لڑکوں نے قہقہوں میں اُڑا دیا۔ عدمؔ کی آواز دبنگ تھی۔ اختر شیرانی سے زیادہ، لیکن گویّوں سے کم، داد پا گئے۔ دونوں کو شِدّت سے یہ احساس دامن گیر ہوگیا .... کہ گلے بازوں نے اُن کی شاعرانہ عظمت کو صدمہ پہنچایا ہے، مداوا کیوں کر ہو؟ مداوے کی یہ شکل ڈھونڈی گئی کہ معمول سے زیادہ شراب پی جائے۔ اِس غرض سے دوستوں کے جیب اُن کی جیب تھے۔ احباب نیازمندی سے نذرانہ پیش کر دیں فَبِہا، نہیں تو کسی نہ کسی ڈھب سے روپیہ وصول کر ہی لیتے تھے۔ جانے قرعۂ فال کس نے نام پڑا، شراب آ گئی۔ دونوں نے ڈٹ کے پی اور بغیر شرک کے پی، یعنی پانی نہیں ملایا۔ پھر دونوں برخوردار قسم کے شاعروں اور گلے باز تُک بندوں کو دیر تک ملاحیاں سُناتے رہے۔ فیصلہ آپس میں یہ کیا کہ اختر نظم کے بادشاہ ہیں اور عدمؔ غزل کے۔ آئندہ ایک دوسرے کے لیے جئیں اور مریں گے۔

اختؔر شیرانی اُس زمانے میں صرف شراب کے لیے جی رہے تھے۔ آخر شراب ہی کے ہاتھوں مر گئے۔ عدمؔ نے اُن کے بعد شراب کو اپنی رگوں کا خون بنالیا اور اختؔر کے حصّے کی شراب بھی اپنے پیمانے میں شامل کر لی۔ آج اٹھارہ برس سے عدمؔ اپنے اور اختؔر کے حصّے کی شراب بھی بلاشرکتِ غیرے پی رہے ہیں۔ نہ اب شراب اُن سے چُھٹ سکتی ہے اور نہ وہ شراب کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں بلا کا عشق ہے۔ عدمؔ کے لہو کی جگہ شراب نے لے لی ہے۔ نتیجۂ عدمؔ اور شراب جڑوان بہن بھائی ہو گئے ہیں۔ اِس شراب نے نہ صرف ان کی صحت کو کھنڈر بنا رکھا ہے بلکہ اُن کی شاعری کا شباب بھی کھا گئی ہے۔ چہرہ ٹوٹا ہوا سبو ہے۔ آنکھیں غلاظت خوردہ پیمانے ہیں، رنگ سیاہ پڑ چکا ہے، ناک ٹھرّے کا پوّا ہے، دانتوں میں کھڑکیاں آ گئی ہیں۔ پیٹ دُخترِ رز کا مٹکا ہوگیا ہے۔ قد یوں جھک گیا ہے جس طرح مُغ

بچوں کی جدائی میں پیرِ مغاں کی پیٹھ بیٹھ جاتی ہے۔غرض اپنے اِن اللّے تللّوں کے ہاتھوں عدؔم اُسی شاہراہ کا مسافر ہے۔جس شاہراہ پر اخترؔ شیرانی بگٹٹ ہو کر منزلِ عدم تک پہنچ چکے ہیں۔

اور عدؔم سے یہ کہنا اپنی ہجو کے لیے اُن کی موزونیِ طبع کو دُشنام مہیّا کرنا ہے کہ بھائی موت کو دعوت نہ دو۔شراب نہ صرف خانہ خراب ہے، بلکہ یہاں وہاں (دُنیا و عقبیٰ) دونوں جگہ عذاب ہے، عذاب النّار، اور اگر تم بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اختر شیرانی کے پاس چلے گئے تو یہ میکدہ جہاں دوستوں کی محفلیں بادۂ سخن کے پیمانوں سے شاد کام ہوتی ہیں، ہمیشہ کے لیے جُڑ جائیں گی۔اپنے لیے نہیں تو اپنے دوستوں ہی کے لیے کچھ دِنوں جی لو، جینا فی نفسہٖ ایک حُسن ہے اور شاعر حُسن کی اہانت نہیں کیا کرتے۔

حمیر ہاشمی

عبدالحمید عدمؔ

عبدالحمید عدمؔ ۱۰۔اپریل،۱۹۱۰ء کو گوجرانوالہ کے ایک گاؤں تلونڈی موسیٰ میں پیدا ہوئے۔ عدمؔ کے بزرگ فوج سے منسلک رہے تھے۔اُن کے دادا سیّد مہتاب شاہ فوج میں صوبیدار تھے۔ والد صاحب بسلسلہ روزگار فیصل آباد میں مقیم تھے۔۱۹۲۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ذمہ داری عدمؔ کے کاندھوں پر آن پڑی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے میٹرک پاس کیا۔ایف اے کرنے کے بعد ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۲۹ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ کے دوران عراق گئے تو وہاں ایک عراقی لڑکی سے شادی کر لی۔۱۹۴۱ء میں ایس اے ایس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان میں تعیّنات تھے۔ تقسیم کے بعد راولپنڈی تبادلہ ہو گیا۔۱۹۵۱ء میں کوئٹہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے محکمہ ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۶۶ء میں اِس عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اگرچہ اپنے محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن افسرانہ رعونت نام کو نہ تھی۔ نہ کسی سے دب کر رہتے اور نہ نچلے طبقے سے افسرانہ برتاؤ کرتے۔

شروع میں رسالہ ”خمستان“ راولپنڈی میں آفتاب احمد کے نام سے لکھنا شروع کیا۔اُس کے بعد اخترؔ تخلص اختیار کیا۔لاہور میں قیام کے بعد عدمؔ صاحب کا زیادہ وقت حکیم یوسف حسن کے بھائی یعسوب الحسن کے رسالہ ”خضرِ راہ“ کے دفتر میں گزرتا تھا۔ وہیں شراب اور شاعری کا دور چلتا۔

وفات سے پہلے عدمؔ بیمار رہنے لگے تھے۔عمر بھر کی شراب نوشی نے اُن کے قویٰ مضمحل کر دیے تھے۔انتقال سے چند ماہ قبل اپنی بیوی کی وفات کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔اپنی زندگی اور

موت کا نقشہ کچھ اِس طرح کھینچ گئے تھے:

موت کتنی ہی سنگ دل ہو مگر
زندگی سے تو مہرباں ہوگی

وفات سے دو تین سال پہلے ہی دوستوں کی محفلیں ختم ہوگئیں اور گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔

جِن دِنوں اُردو شاعری کی فضا پر اخترؔ شیرانی، جوشؔ اور حفیظؔ جالندھری چھائے ہوئے تھے اُنھی دِنوں عدمؔ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ پہلا مجموعۂ کلام ''نقشِ دوام'' ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ عدم بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں۔ اُنھوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا اثر بھی زیادہ قبول نہیں کیا۔ اُن کی شاعری میں سیاسی، سماجی یا معاشی حالات کا ذکر کم ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں زیادہ تر زمانہ حال اور اس کے ماحول سے بے اطمینانی اور روزمرّہ زندگی کے حقائق سے فرار کا عنصر موجود ہے۔ وہ شاعری میں کسی پیغام کے برعکس جذبے اور تخیّل کی فراوانی پر زور دیتے ہیں۔

عدمؔ کے شعری مجموعوں کی تعداد ۴۸ ہے۔ اِتنے مجموعے ترتیب دینا اُن کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ وہ بسیار گو اور زُود نویس شاعر تھے۔ پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۴ء میں اور دوسرا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ اُس کے بعد عموماً ایک ایک سال کے وقفے سے اور بعض مرتبہ تو ایک سال میں دو دو تین تین مجموعے ترتیب دے ڈالے۔ ۱۹۵۹ء میں چھ مجموعے ''آبِ زمزم''، ''نوکِ زباں''، ''خمِ ابرو''، ''خرابات''، ''داستانِ ہیر'' اور ''عکسِ جام'' ترتیب دیے۔

تین مجموعے اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ عدم کے شعری مجموعے بمعہ سنِ اشاعت حسبِ ذیل ہیں:

۱	نقشِ دوام	۱۹۳۴ء	۲۶	رم آہو	۱۹۶۶ء
۲	زُلفِ پریشاں	۱۹۵۰ء	۲۷	نشانِ راہ	۱۹۷۰ء
۳	قول وقرار	۱۹۵۲ء	۲۸	آبِ زر	۱۹۷۱ء
۴	گردشِ جام	۱۹۵۲ء	۲۹	سرو وسمن	۱۹۷۲ء

۵	مکتبِ عشق	۱۹۵۵ء	۳۰	ذِکرِ یار	۱۹۷۲ء
۶	سازوصدف	۱۹۵۵ء	۳۱	جھوٹ سچ	۱۹۷۲ء
۷	شہرِ فرہاد	۱۹۵۶ء	۳۲	آبِ رواں	۱۹۷۴ء
۸	قصرِ شیریں	۱۹۵۶ء	۳۳	جنسِ گراں	۱۹۷۴ء
۹	گُلنار	۱۹۵۷ء	۳۴	سُندر بن	۱۹۷۴ء
۱۰	بطِ مے	۱۹۵۷ء	۳۵	رُسوائیِ نقاب	۱۹۷۴ء
۱۱	شہرِ خوباں	۱۹۵۷ء	۳۶	دستورِ وفا	۱۹۷۵ء
۱۲	آبِ زمزم	۱۹۵۹ء	۳۷	خم کدہ	۱۹۷۵ء
۱۳	نوکِ زبان	۱۹۵۹ء	۳۸	جادۂ درد	۱۹۷۵ء
۱۴	خمِ ابرو	۱۹۵۹ء	۳۹	بہتے موتی	۱۹۷۵ء
۱۵	خرابات	۱۹۵۹ء	۴۰	دولتِ بے دار	۱۹۷۶ء
۱۶	داستانِ ہیر	۱۹۵۹ء	۴۱	جوئے شیر	۱۹۷۶ء
۱۷	عکسِ جام	۱۹۵۹ء	۴۲	چاکِ پیرہن	۱۹۷۷ء
۱۸	باغ و بہار	۱۹۶۰ء	۴۳	نگارخانہ	۱۹۷۸ء
۱۹	درِ جام	۱۹۶۰ء	۴۴	دردِ محبت	۱۹۸۰ء
۲۰	درد و درماں	۱۹۶۰ء	۴۵	دہانِ زخم	۱۹۸۲ء
۲۱	رنگ و آہنگ	۱۹۶۰ء	۴۶	مورتین	۱۹۸۴ء
۲۲	بربط و جام	۱۹۶۲ء	۴۷	نادانیاں	۱۹۸۵ء
۲۳	پیچ وخم	۱۹۶۲ء	۴۸		
۲۴	نصابِ دل	۱۹۶۴ء			
۲۵	بالِ ہُما	۱۹۶۴ء			

عدم کے ان تمام مجموعوں میں سے اُن کے مجموعے ''خرابات'' نے اُنھیں شہرتِ دوام بخشی۔ یہ اُن کا مقبول ترین مجموعۂ کلام ہے اور مشہور شاعر اختؔر شیرانی کے نام انتساب کیا گیا ہے۔۱۹۲ صفحات کی کتاب میں ۱۶۰ غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا آغاز اُن کے اِس خوب صورت شعر سے ہوتا ہے:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اِس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

''خرابات'' میں عدؔم کی شاعری کا رنگ خوب نکھرا ہے۔ گویا عدؔم نے اپنی شاعری کی خصوصیات کو اِس میں سمو دیا ہے۔ یہی مجموعہ اُن کی شُہرت کا باعث بنا اور اسی سے اُنھوں نے نام و مقام کمایا۔ اِس مجموعہ کا آغاز اِس غزل سے ہوتا ہے:

وہ باتیں تری وہ فسانے ترے
شگفتہ شگفتہ بہانے ترے
بس اِک داغِ سجدہ مِری کائنات
جبینیں تری آستانے ترے

اِس عظیم شاعر نے ۱۹۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ کی آرام گاہ قبرستان ڈرائی پورٹ مغل پورہ کے صدر دروازے کے بائیں ہاتھ واقع وسیع دالان کی مغربی دیوار کے ساتھ کچی چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بیٹی کی قبریں ہیں۔

عدؔم راہیٔ مُلکِ عدم ہو گئے لیکن اِس آباد دُنیا میں وہ اپنے خوب صورت شعروں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

کتابیات

☆	مصنف	عنوان	مأخذ
1	اے حمید	سیّد عبدالحمید عدمؔ	چاند چہرے: مکتبہ القریش، لاہور ۱۹۸۵ء
2	سیّد ضمیر جعفری	عدمؔ کا وجود	کتابی چہرے: نیرنگِ خیال نیرنگِ خیال پبلی کیشنز راولپنڈی
3	کشور ناہید	میکدے کی راہ پر چلنے والا	مٹھی بھر یادیں: سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، 2005ء
4	فارغ بخاری	پیرِ مغاں	دوسرا البم: آئینۂ ادب لاہور، س ن
5	ڈاکٹر سلیم اختر	حضور! عدم آیا ہے	درشن جھروکہ: سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور، 2009ء
6	شاد امرتسری	سیّد عبدالحمید عدم	نقوش لاہور: شخصیات نمبر جلد دوم
7	حافظ لدھیانوی	سیّد عبدالحمید عدمؔ	متاعِ گم گشتہ: ناشر حافظ سراج الحق لاہور، 1990ء بار دوم
8	قمر یورش	عبدالحمید عدمؔ	یارانِ میکدہ: عوامی پبلشرز لاہور، 1983ء
9	حزیں کاشمیری	عبدالحمید عدمؔ	کہاں گئے وہ لوگ: اُردو کتاب گھر لاہور، 2005ء
10	اکمل علیمی	حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا	لاہور کے اہلِ قلم: سنگِ میل پبلی کیشنز لاہوت، 2014ء
11	صادق نسیم	سیّد عبدالحمید عدمؔ	روشنی چراغوں کی: عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد، 2003ء
12	اسرار زیدی	عدم کا آخری انٹرویو	بام و در جن سے روشن ہوئے: مقبول اکیڈمی لاہور، 2007ء
13	اسرار زیدی	موت برحق ہے مگر!	بام و در جن سے روشن ہوئے: مقبول اکیڈمی لاہور، 2007ء
14	شورش کاشمیری	عبدالحمید عدمؔ	قلمی چہرے: مجلسِ یادگارِ شورش کراچی، 1999ء
15	حمیر ہاشمی	سیّد عبدالحمید عدمؔ	لاہور میں دفن خزینے: علم و عرفان پبلشرز لاہور 1998ء